غدر کے چند علماء

از

مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی

نیا کتاب گھر اردو بازار دہلی

فہرست



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش آہنگ

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں علماء کا جس قدر شاندار کارنامہ اور جذبۂ وطنیت کا مظاہرہ ہے۔ اس کی مثال کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار اور تغلب واستیلا کے خلاف سب سے پہلے علماء ہی کی آواز مخالف اٹھی۔ انھیں علماء میں کا پہلا فردِ محترم جو سر بکف میدانِ عمل میں آیا، وہ دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی تھا۔ اُن کے ہمنوا کثیر التعداد علماء اُٹھے جو ایک طرف درس و تدریس تصنیف و تالیف میں لگے ہوئے تھے دوسری طرف سیاستِ ملکی میں حصہ لے رہے تھے۔ ان میں نمایاں شخصیت مولانا امام بخش صہبائی شہید۔ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ نواب شیفتہ۔ مولوی عظیم اللہ کانپوری منیر شکوہ آبادی وغیرہ تھے۔ مگر افسوس ہے کہ ان بزرگوں کے سیاسی حالات سے تذکرہ نویسوں نے چشم پوشی کی۔

دلاور جنگ اور عظیم اللہ سر براہ کار نانا راؤ پیشوا وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے پہلی جنگ آزادی کی اسکیم بنائی قبل از وقت ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اپنوں کی دغابازی سے تحریک دب گئی۔ انگریز پہلے سے اور زیادہ طاقتور ہوگیا اس نے نوے برس تک اس جنگ کو غدر کا خطاب دیکر وہ پروپیگنڈہ کیا کہ عوام تو عوام خواص کے زبانوں پر جنگ آزادی کا نام غدر پڑ گیا۔

ملک آزاد ہوا اولین علمبرداران جنگ آزادی کے حالات اور ان کے سیاسی کارناموں کو بر سر عام لانے کے لئے مکرمی مولوی محمد عبد الحق صاحب فاروقی مالک نیا کتاب گھر کی فرمائش پر یہ تذکرہ

غدر کے چند علماء

کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا جاتا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں مولوی سید الطاف علی صاحب بریلوی بی۔ اے ایڈیٹر مصنف علی گڈھ کا مشورہ قابل ذکر ہے۔

انتظام اللہ شہابی

مولانا امام بخش صہبائی شہید دہلوی

مولانا صہبائی ہندوستان میں فارسی زبان کے مسلم الثبوت استاد تھے۔

فارسی زبان کا چراغ ہندوستان میں مدت سے ٹمٹما رہا تھا اور فارسی شاعری کی طبعی عمر اختتام کے قریب تھی۔ مگر حسنِ اتفاق دیکھئے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کے زمانہ میں کچھ اس نے سنبھالا لیا کہ چند صاحبانِ فضل و کمال خاص دار الخلافہ دلی میں آ جمع ہوئے۔ کچھ خاک پاک دلی سے پیدا ہوئے۔ کچھ حضرات باہر سے آ بسے۔ ہر ایک یگانۂ روزگار تھا۔ یہ لوگ علم و فضل کے ساتھ شعر و سخن میں بھی صاحب کمال تھے۔

علامہ فضل حق خیر آبادی۔ مولانا عبداللہ خاں علوی قائم گنجی حکیم مومن خاں مومن۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر۔ سید غلام علی خاں وحشت۔ نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب اکبر آبادی۔ مولوی امام بخش صہبائی سے حضرات فارسی کے دلدادہ و جان دادہ تھے۔ صہبائی تو اس کے عاشق و شیفتہ تھے ہی۔ بلکہ اسیر

سے ہوئے تھے۔ تمام عمر فارسی زبان کی خدمت میں ہی گذار دی۔

نام و نسب مولانا امام بخش صہبائی۔ مولانا محمد بخش تھانیسری کے خلفِ ارشد تھے۔ صہبائی کے دوسرے بھائی حکیم پیر بخش تھے۔ مرزا قادر بخش صابر گورگانی "گلستانِ سخن" میں لکھتے ہیں کہ:۔

سلسلہ ان کے نسب کا ان کے والد ماجد مرحوم و مغفور کی طرف سے تو فاروق حق و باطل فاروق ابن خطاب علیہ رضوان اللہ الوہاب تک اور زبدۂ مستورات سراپردۂ عصمت و عفت حضرت والدہ شریفہ غفر اللہ لہا کی جانب سے قدوۂ واصلان درگاہ رہنمائے سالکان عرفان دستگاہ محبوب سبحانی سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے

صہبائی کے والد ماجد تھانیسر سے دلی آئے اور رہ پڑے۔ کوچہ چیلاں میں مکان بنا لیا تھا۔

تعلیم و تربیت صہبائی غریب گھرانہ کے فرد تھے۔ علوم فارسی و عربی علامہ عبد اللہ خان علوی سے حاصل کئے۔ علوی خاں اپنے زمانہ کا استادِ وقت تھا۔ عربی، فارسی کا مسلمہ استاد تھا۔ اِس کے ساتھ ہی عربی فارسی، اردو میں فکرِ سخن بھی کرتا تھا۔ ریختہ میں کہتے ہیں کہ ؎

دامن سے ڈھانک جیسے کوئی لے چلے چراغ
جاتے ہیں سوزِ عشق لئے یوں کفن میں ہم

شاعری حضرتِ علوی کی شعر و شاعری کا اثر صہبائی پر پڑے بغیر نہ رہا۔ یہ کم عمری سے فارسی میں فکرِ سخن کرنے لگے۔ اردو میں گنتی کے

لہ گلستانِ سخن

شعر کہے۔ فارسی سے دلی لگاؤ تھا۔ اس میں ہی شعر گوئی کرتے تھے۔ ذاتی کاوش
اور استاد کی توجہ سے فارسی زبان پر تبحّر کا درجہ حاصل کیا۔ عربی میں بھی
معقول استعداد بہم پہنچائی۔ حقیقت یہ ہے کہ باکمال استاد نے وہ گُر
سکھائے تھے کہ نوعمری میں مرزا قتیل فرید آبادی کے ہم پایہ استاد سمجھے
جانے لگے۔ اور ہم چشموں میں عزت و قدر سے دیکھے جاتے تھے۔ سر سیّد
احمد خاں "آثار الصنادید" میں آپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"کمالاتِ ظاہری اور جلائلِ باطنی اور حسنِ خُلق اور حمائد اطوار میں
پسندیدۂ خالق و مقبولِ خلائق ہیں۔ خلق دلکش آپ کا آئینۂ بہار او
اوضاعِ حمیدہ آپ کے محمود روزگار اس فردِ زماں میں ایسی جامعیت
کے ساتھ کم کوئی نظر سے گزرا ہے۔ اور طرفہ یہ ہے کہ فنونِ متعارفہ
وسخنوری مثل تحقیق لغت واصطلاحات زبان دری اور تدقیق مقالات
کتابی اور تکمیل عروض و قافیہ واستکمالِ فن معما وغیرہا میں ایسا کمال
بہم پہنچایا ہے کہ ہر فن میں ایک فنّی کہنا چاہیے ؎

پذیرفتہ از ہر فنے روشنی — جداگانہ در ہر فنے یک فنی

ملازمت

مولانا محمد حسین آزاد "آبِ حیات" میں لکھتے ہیں کہ:۔
۱۸۴۲ء میں جبکہ دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا، مسٹر ٹامسن
سکرٹری گورنمنٹ ہند جو آخر کو اضلاع شمال و مغرب میں لفٹنٹ گورنر
ہوگئے تھے۔ مدرسین کے امتحان کے لئے دلی میں آئے اور چاہا کہ جس
طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرس ہے فارسی کا بھی استاد مقرر کیا جائے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے "مرحوم دہلی کالج" کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ :۔

"مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور نے لفٹنٹ گورنر سے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ۔ دوسرے حکیم مومن خاں۔ تیسرے امام بخش صہبائی۔ لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے تھے انھوں نے تو انکار کر دیا۔ مومن خاں نے یہ شرط کی کہ سَو روپیہ ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا انھوں نے یہ خدمت چالیس روپیہ ماہانہ کی قبول کر لی۔ بعد کو پچاس ہو گئے"[1]

کچھ عرصہ بعد مسٹر بوتروس پرنسپل مدارس دلی کے عہد میں صہبائی مدرس اول کے عہدہ پر سرفرانہ کئے گئے۔

فضیلت "مرحوم دہلی کالج" میں ہے۔

"مولوی امام بخش صہبائی صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے مصنف اور شاعر بھی تھے۔ ان کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ ان کی بعض کتابیں اب تک پڑھی جاتی ہیں۔ شہر میں ان کی بڑی عزت تھی"۔ (صفحہ ۱۴۹)

گارساں دتاسی فرانسیسی اپنے خطبات اردو میں لکھتے ہیں۔

"مولانا صہبائی منشی کریم الدین کے ہمعصر ہیں۔ اور منشی صاحب اپنے

---

[1] مرحوم دہلی کالج صفحہ ۱۵۰ طبقات الشعراء مولوی کریم الدین دہلوی و تاریخ نثر اردو صفحہ ۴۹۸

تذکرۂ شعرا میں بیان کرتے ہیں کہ یہ قابل مصنف دہلی میں فارسی کے سب سے
زیادہ فاضل ادیب تصور کئے جاتے ہیں اور اس وجہ سے دہلی کالج میں
فارسی کے پروفیسر مقرر کئے گئے۔[1]

تصانیف مولانا صہبائی کا درس و تدریس کے بعد تمام وقت تصنیف و تالیف
میں گذرتا تھا۔ فارسی میں کثرت سے کتابیں لکھیں۔ اُردو کی کتابوں
کی ملک میں مانگ دن بدن بڑھ رہی تھی۔ اور قدر بھی ہونے لگی تو اس طرف بھی
توجہ کی۔ جس سال کالج میں منسلک ہوئے منشی شمس الدین فقیر کی تصنیف حدائق
البلاغت (مصنفہ ۱۱۶۸) کا اردو ترجمہ مرتب کیا۔ مولانا حامد حسن قادری پروفیسر
سینٹ جانسن کالج آگرہ" اپنی کتاب "داستان تاریخ اردو" میں لکھتے ہیں:۔

"صرف کہنے کو ترجمہ ہے۔ ورنہ اصل میں فن بلاغت کو اردو میں منتقل
کیا ہے۔ یہ اردو میں اس فن کی پہلی مکمل و مستند کتاب ہے۔"[2]

"مرحوم دہلی کالج" میں ہے۔

"اردو صرف و نحو پر بھی ایک اچھی کتاب لکھی۔ جس کے آخر میں بترتیب
حروف تہجی اُردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج
ہیں۔ شعرائے اردو کا انتخاب بھی تیار کیا تھا جو اسی زمانہ میں طبع ہو کر
شائع ہوا۔ (صفحہ ۱۹۹)

گارساں دتاسی لکھتا ہے:۔

"سب سے آخر میں قابل ذکر کتابیں صہبائی کی تصانیف ہیں جن کے

[1] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۱۷۰ [2] داستان تاریخ اردو صفحہ ۲۰۳

نام یہ ہیں۔ حدائق البلاغت۔ انتخابات نظم اور قواعد اردو۔ ان کی قواعد اردو اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابلِ قدر ہے کہ اس کے آخر میں ضرب الامثال اور محاورات کی ایک فہرست درج ہے[1]

اُردو کی خدمت

مولانا نے صحیح معنی میں اردو کی ہر عنوان سے خدمت کی ہے۔ سر سید احمد خاں نے "آثار الصنادید" کی ترتیب میں صہبائی سے کافی مدد لی جس کا اعتراف بھی کیا ہے "گلستانِ سخن" کی تصنیف میں پوری پوری صہبائی کی کارفرمائی کو دخل ہے۔ مقدمہ بالخصوص آپ کا لکھا ہوا ہے۔ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ نے "خمخانۂ جاوید" کی تقریظ میں ایک جگہ لکھا ہے۔ "گلستانِ سخن حضرت صہبائی کی تصنیف سے ہے[2]"

فارسی میں "کلیاتِ صہبائی" میں نظم و نثر کے رسائل شائع ہو گئے ہیں۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔

"صہبائی جن کی نظم و نثر فارسی اور دیگر رسائل اور شروح تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں[3]"

شرح

شرح "سہ نثر ظہوری" سنہ ۱۲۶۰ھ میں لکھی ایک رسالہ "معما" کے حل میں لکھا۔ اس میں ایک شعر سے سات سو نام نکلتے ہیں۔ اردو زبان کے شعراء کا مجموعہ تیار کر کے اس میں غزلیات اور گیت گانے بجانے کی مع تعریف قصیدہ اور بیان بحور عروض کے چھپوایا[4]۔

---

[1] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۷۰، [2] خمخانۂ جاوید حصہ اول تقاریظ

[3] یادگار غالب صفحہ ۲۲۰۔ [4] طبقات الشعراء مولوی کریم الدین

علامہ عبداللہ خاں علوی قائم گنجی کا ایک شاگرد نرائن داس تنبولی تھا۔ خاکی کی استعداد اس کو بڑی معقول تھی۔ علمی لیاقت حاصل کرنے کے بعد اپنا آبائی پیشہ قائم رکھا۔ ایک پیر میں لنج تھا۔ وہ دکان پر پیر پر پیر رکھے بیٹھا رہتا۔ اور پان کی گلوریاں لگاتا رہتا۔ اس کے ساتھ طلبا فارسی کو بھی درس دیتا۔ طلبا دوکان کے نیچے کتابیں لئے کھڑے رہتے۔ کوئی "سہ نثر ظہوری" پڑھتا۔ کوئی "بہار دانش" کا سبق لیتا۔ کوئی "سکندر نامہ" سناتا۔ ہر ایک کو بتاتا اور شرح اور نکات بیان کرتا۔

بروایت مولوی عبدالحمید خاں صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، انھوں نے اپنے والد مولوی عبدالغنی مصنف "ارمغان آصفی" جو علامہ عبداللہ کے شاگرد تھے بیان کیا کہ علامہ کے یہاں ایک امامی نامی خاکروب تھا اس کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ جو سنتا وہ یاد ہو جاتا۔ علامہ طلبا کو درس دے رہے ہیں۔ یہ خاکروبی کرتے ہوئے آئے کھڑے سن رہے ہیں۔ کسی نے کہا میاں امامی کیا سنا۔ فرفر پورا سبق سنا دیا۔ عام اساتذۂ دلی کے منتخب اشعار نوک زبان تھے۔ سخن فہمی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مشاعرہ میں یا کہیں مجلس ہوتی آپ کے لئے ایک چوکی بچھائی جاتی اس پر شیخ امامی بیٹھتے اور شعرا اپنا کلام ان کو مخاطب کر کے پڑھتے۔ اگر کسی شعر پر ان کا سر ہل گیا بس مقبولیت اس کو حاصل ہو گئی۔ ذوق۔ غالب۔ مومن ہر ایک ان کی قدر کرتا تھا۔ یہ تھے دلی کے روڑے

طب کی فن طب میں بھی صہبائی نے کمال حاصل کیا تھا مگر مطب نہیں کیا۔ آپ کے بھائی مشہور

طبیب حکیم پیر بخش تھے

احباب میں قدر و منزلت

مولانا صہبائی جس سبھا کے رکن رکین تھے صاحبِ "گلِ رعنا" کے لفظوں میں سنئے۔

"دلی اس وقت آج کی ایسی دلی نہ تھی۔ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر مولوی امام بخش صہبائی۔ علامہ عبداللہ خاں علوی۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ مرزا اسداللہ خاں غالب۔ نواب ضیاء الدین خاں نیر۔ شاہ نصیرالدین نصیر۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق۔ حکیم آغا جان عیش۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان۔ میر حسین تسکین اور خدا جانے کتنے سخنورانِ باکمال کا جمگھٹا تھا جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔

یہ سب حضرات صہبائی کی قدر و منزلت کرتے تھے۔

غالب و صہبائی

مرزا غالب اور صہبائی میں گہرے تعلقات تھے، ایک دوسرے کی قدر دانی کرتا تھا۔ چنانچہ مرزا نے اپنے کلام میں جہاں معاصرین کا ذکر کیا ہے، صہبائی کو نہیں بھولے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ

حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

جہاں مرزا صاحب نے اپنی ہمہ دانی کو ٹھیس لگتے ہوئے دیکھا، دوستی و ملاقات کو بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ چنانچہ "قاطع برہان" کی مخالفت میں مرزا رحیم بیگ شاگرد مولانا امام بخش صہبائی ساکن میرٹھ نے "ساطع برہان" شائع

کی۔ مرزا صاحب چراغ پا ہو گئے۔ رحیم الدین کی لے دے شروع کر دی۔ مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھ ڈالا۔

"نامۂ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ بھی ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو اُن کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اُس ہیچ پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عزّ و وقار ہو۔[1]"

غرضکہ مرزا غالب رحیم بیگ سے بگڑے ہوئے تھے۔ بچارے صہبائی پر بھی لگے ہاتھوں لے دے کر گئے۔

دلّی کے دیوان خانے مولانا فضل حق کے یہاں اُن کے والد مولانا فضل امام صدر الصدور کے زمانہ سے بعد نماز عصر روزانہ اہل علم کی صحبت رہا کرتی۔ علماء و فضلاء آ جمتے۔ علمی مذاکرے رہتے۔ معمولی لکھے پڑھے کی تو گذر ہی نہ تھی۔ شب میں مفتی صدر الدین خاں کے یہاں محفل جمتی۔ مولانا صہبائی ہر دو جگہ کے بیٹھنے والے تھے۔ مفتی صدر الدین کا مکان چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے تھا۔ اُس کے نزدیک مٹیا محل میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رہتے تھے۔ مکان کوٹھی کے نمونہ کا تھا۔ انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضعوں کو ساتھ ملا کر بنایا گیا تھا۔ صحن گو بہت بڑا نہیں۔ مگر اسمیں مختصر سی نہر، سامنے دالان در دالان۔ پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے۔ باہر کے دالان

---

[1] "غالب"، صفحہ ۴۴

میں کواڑ لگا کر اس کو بھی کمرہ کی شکل کا کر دیا تھا۔ دالانوں کے سامنے اونچا چبوترہ جس پر شست کا چوکہ لگا ہوا تھا اُس پر دری اور دری پر چٹی چاندنی کا فرش، اور دو طرف گاؤ تکئے لگے ہوئے ہوتے۔ آنے والے حسب مراتب بیٹھتے۔ اس محفل کی کیفیت پیشوائے علم مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی سے سنئے۔ فرماتے ہیں۔

"والد مرحوم دہلی کے دیوان خانوں کی مجلس کے جو افسانے سنایا کرتے تھے۔ بجھنے والے چراغ کا یہ آخری اُجالا تھے۔ مرحوم دہلی کی ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی۔

مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا جاڑا، گرمی، برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا اگر کوئی نووارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک مجلس دیکھ لے وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رُخ کرتا۔ ان صحبتوں کے رکن ایک حضرت صہبائی بھی تھے۔ کالج سے لوٹتے گھر آتے۔ پھر شام کو ہوا خوری کے بجائے مولانا فضل حق خیر آبادی کے یہاں جاتے۔ وہاں سہ پہری فواکہات کھاتے۔ شب میں بعد نماز عشاء مفتی صاحب کے یہاں جاتے۔ یہاں کی محفل برخاست ہوتی تو گھر جا کر سو رہتے"[1]

فارسی کی — ہندوستان میں صرف دلی کو یہ فخر حاصل تھا کہ فارسی زبان کے ماہر مثل اہلِ زبان کے دلی ہی میں کثرت سے تھے۔ یہاں کی فارسی زبان میں

---

[1] "غالب" از مولانا مہر صفحہ ۲۵۔

وہی چٹخارہ تھا جو اہلِ زبان میں ہوا کرتا ہے۔ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر قصہ خواں فارسی میں قصہ خوانی کرتے تھے۔ "بوستانِ خیال" زبانی سُنائی جاتی۔ عوام تو عوام خواص شریک ہوا کرتے۔ زبان دانی کے لئے اہلِ علم اس صحبت میں شریک ہوتے بےفکرے جمع ہو جاتے۔ کم عمری میں صہبائی بھی شریک ہوئے ہیں، اپنے زمانے میں مرزا محمد حسین قتیلؔ فرید آبادی نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر زبان حاصل کی ہے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں ایرانی کی وجہ سے کثرت سے ایرانی دلّی میں آبسے تھے۔ ان کا جماؤ عموماً بعد نماز عشاء جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ہوا کرتا۔ انھیں ایرانیوں میں سے مُلّا محمد باقر تھا جس نے فرید آباد میں رہنا اختیار کیا تھا۔ اس سے ہی قتیل نے فارسی پڑھی، ایسے گرویدہ ہوئے ہندو مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گئے اور نجف خاں کی صحبت اختیار کی۔ پھر ایران گئے۔ لوٹے تو لکھنؤ گئے۔ اور آصف الدولہ کے پاس میر انشاء اللہ خاں کے توسل سے پہونچے۔

لطیفہ | دلّی میں علم و فضل کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا گھرانہ فارسی میں بھی یگانہ حیثیت رکھتا تھا۔ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی فارسی دانی اور زبان کی شہرت عام تھی۔ شاہ صاحب کا "تحفۂ اثنا عشری" لکھنؤ پہونچا۔ آصف الدولہ نے مجتہدین شیعہ سے درخواست کی کہ تحفہ کا جواب لکھا جائے۔۔ مجتہدین میں سے مولوی دلدار علی خاں نے جواب لکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن "تحفہ" کی زبان چونکہ بے نظیر تھی اس لئے مرزا قتیل سے کہا گیا کہ مضامین قبلہ و کعبہ لکھیں اور آپ ان کو اپنی عبارت میں ادا کر دیں۔ تاکہ مضامین کا جواب

مضامین سے اور عبارت کا جواب عبارت سے ہو جائے۔ مگر قتیلؔ نے عذر کیا، اور کہا میں شاہ صاحب کی سی فارسی عبارت لکھنے پر قادر نہیں ہوں اور اس کی تائید میں انھوں نے بیان کیا کہ دلی میں ایک رنڈی سے میرے تعلقات ہیں۔ میں نے نہایت دماغ سوزی سے اپنی پوری قابلیت صرف کرکے اُسے ایک خط لکھا تھا وہ رنڈی خط کو دلی کے تمام لائق وفائق لوگوں کے پاس لے گئی اور درخواست کی کہ اس کا جواب لکھ دیا جائے۔ مگر اس کے جواب لکھنے کا کسی نے اقرار نہیں کیا۔ مجبور ہو کر وہ اس خط کو شاہ صاحب کی خدمت میں لے گئی اور ظاہر کیا کہ میں تمام جگہ پھر چکی ہوں۔ مگر کسی نے جواب کی حامی نہیں بھری۔ اب میں مجبور ہو کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ حضور اس کا جواب لکھ دیں۔ شاہ صاحب نے خط سنتے ہی فوراً قلم برداشتہ اس کا جواب لکھوا دیا۔ وہ خط چھ مہینے سے میرے پاس رکھا ہوا ہے اور میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کا جواب لکھوں۔ مگر اب تک مجھ سے اس کا جواب نہیں ہو سکا۔ اب آپ غور فرما لیں کہ میں تحفہ کی عبارت کا جواب کس طرح دے سکتا ہوں۔ جب قتیلؔ نے عذر کیا تو ناچار قبلہ وکعبہ نے خود ہی جواب لکھا۔ اس جواب کو نواب صاحب نے مرزا قتیلؔ کے سامنے پیش کیا، اور پوچھا کہ بتلائیے کیسا جواب ہے۔

مرزا قتیلؔ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو عرض کروں۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ فرمائیے۔ مرزا قتیلؔ نے کہا سچ تو یہ ہے کہ قبلہ وکعبہ نے تو اپنی کتاب کا نام بھی رکھنا نہ آیا۔ شاہ صاحب تو تحفہ پیش کرتے ہیں اور قبلہ وکعبہ تحفہ کے جواب میں ذوالفقار (نامی کتاب) اس کے بعد نواب

نے فرمایا کہ اچھا عبارت کی نسبت کچھ کہئے قتیل نے کہا کہ حضور کہاں جائس کا جولاہہ (قبلہ وکعبہ جائس کے رہنے والے تھے) اور کہاں دلی کی سیڑھیوں کا بیٹھا ہوا شہدا۔ غرضکہ واقعہ ہے صہبائی نے آنکھ دلی کے اہلِ علم حضرات کی صحبت میں کھولی کچھ سے کچھ ہو گئے۔ فارسی دانی میں جواب نہ رکھتے تھے۔

بزمِ شعر و سخن دلی میں مشاعرہ کی بِنا قاضی سراج الدین علیخاں آرزو نے ڈالی۔ ان کے عہد سے لے کے میر اور غالب تک یہ سلسلہ شاندار طور سے رہا۔ میر نظام الدین ممنون کے مدرسہ اور مفتی صدر الدین خاں اور نواب شیفتہ کے دیوان خانوں میں بڑے پیمانہ پر مشاعرے ہوتے قلعہ میں جیسے حضرتِ ذوق کی گرم بازاری ہوئی۔ بادشاہ اور شہزادوں کی طرف سے آئے دن مشاعرے ہوا کرتے۔ دلی کے اساتذہ سب ہی ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے ممنون آزردہ۔ غالب۔ ذوق۔ صہبائی۔ عارف۔ محو۔ احسان وغیرہ۔ اربابِ شعر و ادب کی شمولیت ضرور ہوتی۔ ان بزرگوں کی صحبت سے شہزادگانِ تیموریہ میں شعر و شاعری کا ذوق کافی پیدا ہو گیا تھا۔

قلعہ کے مشاعرے قلعہ میں شہزادوں اور بادشاہ کی طرف سے جو مشاعرہ ہوتا وہ شاہانہ انداز سے ہوتا۔ بادشاہ سلامت خود بنفسِ نفیس شرکت فرما کر عزت بخشتے تھے۔ شہزادے عموماً مشاعرہ کرتے تھے قلعہ میں عجیب چہل پہل رہتی۔ مرزا محمد اختر گورگانی نبیرۂ مرزا دارالجنت ولی عہد بہادر ابوظفر راقم السطور کے ملنے والے ہیں۔ میرے مکان کے قریب ایک عرصہ تک "کیرانہ" سے آکر رہے تھے۔ حیدرآباد سے یک صدی روپیہ کا منصب تھا۔

عہ امیر الروایات صفحہ ۴۴

وہ قلعہ کے مشاعروں کا اپنے والد کی زبانی ذکر کیا کرتے تھے۔ مشاعرے "دربارِ عام" اور کبھی "باغِ حیات بخش" میں منعقد ہوا کرتے۔ "باغِ حیات بخش" میں ایک محل سنگِ سُرخ کا بنا ہوا ہے۔ اس کو سنگِ مرمر کے ایک ہی سفید کر کے رنگ آمیزی و طلا کاری کے گل بوٹے سے مزین کیا تھا۔ محل میں ایک درجہ پندرہ گز لمبا اور آٹھ گز چوڑا تھا جہاں شعر و سخن کی صحبت رہتی۔ اُس میں ایک حوض بھی تھا جس کا فوارہ ہر وقت چھوٹا کرتا تھا۔ اس باغ میں ساون بھادوں کی عمارتیں تھیں۔ مشاعرے کے دن ساون بھادوں کا سماں بھی رہتا تھا۔

۲۵۔ فروری ۱۸۵۲ء کو محل "حیات بخش" میں بادشاہ کی طرف سے مشاعرہ کا انتظام ہوا۔ شاہانہ اہتمام و انتظام کیا گیا۔ محل فرش و فروش جھاڑ فانوس سے سجایا گیا۔ بادشاہ کی طرف سے اذنِ عام ہوا۔ اساتذۂ دلی کو دعوت دی گئی۔ چنانچہ سب شعراء قلعہ میں جمع ہوئے۔ خاندانِ بابر کے شہزادے ایک ایک نے شرکت کی۔ مرزا اعظم شاہ نبیرۂ سلیمان شکوہ متخلص آزاد۔ مرزا وحید الدین متخلص اختر۔ مرزا سپہر شکوہ اسرار۔ مرزا غلام محی الدین اشکی۔ مرزا بلاقی بدر مرزا الطاف تاب۔ مرزا معز الدین ثابت۔ مرزا عزیز الدین سرور، داماد ابو ظفر بہادر شاہ، سلطان شاہ سلطان مرزا فخر الدین سیارہ۔ مرزا نور الدین شاہی۔ مرزا حاجی نادر بخش ششدر۔ مرزا بلند بخت فدا۔ مرزا سکندر بخت فدا۔ مرزا مصلح الدین صالح۔ مرزا عزیز الدین عزیز۔ مرزا نصیر الدین قناعت۔ مرزا خدا بخش قیصر۔ شہزادہ بہرام شاہ محب۔ مرزا منگو محزون۔ مرزا محمود محمود۔ مرزا حسین متخلص مرزا حضرتِ ذوق۔ حضرت غالب۔ صہبائی۔ عارف۔ نیر وغیرہ مشاہیر شعرائے دہلی

شریک ہوئے

ان کے علاوہ دوسرے لوگ اس قدر تعداد میں آئے کہ نشست گاہ میں بیٹھنے کو جگہ تک نہ تھی۔ شعراء و سامعین سب جمع ہو گئے تو سلطان الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوق نے اولاً بادشاہ ابوظفر کی غزل پڑھی جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

گردشِ چشمِ بتاں سے دل کو ہو کب مخلصی
حلقۂ گرداب سے نکلے ہے کب ڈوبا ہوا
خار سا کھٹکے ہے جی میں اُسکی مژگاں کا خیال
ہے رگِ جاں میں یہ نشتر کیا غضب ڈوبا ہوا

پھر شہزادہ حضرت سلطان نے اپنی غزل سنائی جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

تارِ نفس کے ساتھ ہے اُلجھا ہوا یہ تار
نکلے گا دم بھی ساتھ جو نالہ رسا ہوا
گالی سے کون خوش ہو مگر حُسنِ اتفاق
جو تیری خُو تھی وہی مدعا ہوا

ان کے بعد مرزا حیدر شکوہ مرزا نورالدین نے غزل سنائی۔ مرزا روشن الدولہ ابن مرزا آغا جان شُشدر رکھتے ہیں ؎

کام تو کچھ بھی نہیں ہے حشر میں اپنا مگر
آن نکلیں گے تری خاطر اگر آنا ہوا

قطب علی عالی دہلوی فرماتے ہیں ؎

کل تو علی کا حال بہت ہی تباہ تھا
کیا گزری آج اس پہ خدا جانے کیا ہوا

مرزا علاء الدین ابن مرزا منور بخت بناری متخلص آرزو کہتے ہیں ؎

یاں بیخودی ہے مانع نظارہ ہم نفس
اُس نے جمال اپنا دکھایا تو کیا ہوا

حافظ محمد حسین بسمل کی باری آئی وہ فرماتے ہیں ؎

شکوہ مت کر حال جو بسملؔ ترے دل کا ہوا
شکر ہے ہر حال میں جو کچھ ہوا اچھا ہوا

مرزا غیاث الدین تمنا کہتے ہیں ؎

اے تمناؔ دل پہ کیوں رکھے ہوئے ہو ہاتھ تم
پھر کہیں کیا دل لگا عشقِ بتاں پیدا ہوا

مرزا حاجی شہرت خلف مرزا قیام الدین نے کم و بیش ستر شعر زمینِ طرح میں سنائے ؎

ہے یہ مستی میں بھی ہشیاری کہ اب اس کا نقاب
رُخ سے سرکا ہی تو ہے ایک یوں ہی سا سرکا ہوا

اہل عالم کی نظر میں شانِ ظالم ہے بلند
ہے فلک ان سب کی نظروں میں بڑا ٹھہرا ہوا

مرزا قادر بخش صابر صاحبِ "گلستانِ سخن" نے غزل سنائی ؎

ہے نگاہِ آشنا کو ہر جگہ جلوہ سے ربط
دیر بھی کعبہ تھا جب میں ناصیہ فرسا ہوا

وصل سے عاشق نے پایا مرتبہ معشوق کا
قطرہ خود دریا ہوا جب داصل دریا ہوا

صابر کے بعد نواب زین العابدین خاں عارف نے پُر درد لہجہ میں اپنی غزل سنائی۔ ایک شعر تحریر ہے ؎

رسوا ہوا تو اہلِ وفا میں ہوا عزیز
اچھا ہوا وہ حق میں مرے جو بُرا ہوا

مولوی امیر علی عالی نے فارسی میں طرحی اشعار سنائے۔ کہتے ہیں ؎

شکایتے چہ کنم از بتاں کہ خود دلِ من
ہمیشہ دشمنِ جانم بود کنارِ مرا

نواب ضیاء الدین خاں نیر نے فارسی طرح پر غزل کہی۔ کہتے ہیں ؎

بس است طول خدایا شبانِ تارِ مرا
بیاضِ صبح مدد چشم انتظارِ مرا

اس کے بعد مولانا امام بخش صہبائی نے پہلے یہ رباعی پڑھی ؎

شاہا بدرت کہ اہل عز و جاہ است
انعوش ہزار سالہ آں سو راہ ست
از چرخ نہم سوال کردم گفتند
لیکن ذرہ عتبہ بہادر شاہ ست

غزل طرحی ؎

چہ گل کہ در کفِ پا نشگفد زخارِ مرا
جنوں بفصلِ خزاں میکند بہارِ مرا

چنانکہ بادہ در انگور نیست بادہ بنام
بہر کجا کہ توئی نیست اعتبارِ مرا

برنگِ لالہ در آغوش نو بہار نہ ہشت
ز دستِ داغِ دل آسودہ روزگارِ مرا

فلک بماتم یارانِ رفتہ صہبائی
سرود باغ و دل و چشم اشکبار مرا

حالی کے پاس مرزا غالب بیٹھے ہوئے تھے اپنی غزل دس شعر کی غیر طرحی سنائی

نوید امن ہے بیدادِ دوست جاں کیلئے | رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے
بلا سے گر مژہ یار تشنہ خون ہے | رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کیلئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

نواب مصطفیٰ خاں فرماتے تھے ذوق نے شعر سوم کی مشاعرہ میں بے حد تعریف کی اور بار بار دوہرایا۔ عموماً مرزا غالب مشاعروں میں فارسی کی طرح پر غزل کہا کرتے تھے۔ یہ پہلی مرتبہ اردو میں غزل سنائی۔ مولانا حالی نے بھی قلعہ کے مشاعرہ کا ذکر کیا ہے۔ کہ ذوق اور غالب نے ہم طرح غزل پڑھی تھی۔ مشاعرہ ساری رات جاری رہا سب کے آخر میں سلطان الشعرا ذوق نے غزل طرح پر سنائی اور مرزا صاحب نے جو غزل پڑھی اس پر بھی فی البدیہہ شعر سنائے۔ پہلے بادشاہ کی شان میں رباعی کہی۔ کہتے ہیں ؎

چاہے نہ اشرفی آفتاب عالم میں
خطِ شعاع سے اس پر اگر نہ ہو تحریر
ابوظفر شہِ والا گہر بہادر شاہ
سراجِ دینِ نبی سایۂ خدائے قدیر

غزل طرح ؎

(۱) غالب از مولانا دہر صفحہ ۸۶

پانی طبیب دے ہے ہمیں کیا بجھا ہوا
ہے دل بھی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا

کہتے تھے آفتاب قیامت جسے سو وہ
نکلا چراغِ داغِ دل اپنا بجھا ہوا

چشمِ غضب سے ہم نگہ مہر واسطے
ایک نیمچہ ہے زہر میں گویا بجھا ہوا

پہلے نشانہ کرتا وہ بندوق کا مجھے
پر تھا میرے نصیب سے توڑا بجھا ہوا

جل کر اگر بجھا بھی دلِ سوختہ مرا
سو جل اٹھے گا جیسے کہ کوئلا بجھا ہوا

ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو
سینے میں ہم نے ذوق نہ پایا بجھا ہوا

مرزا غالب جا چکے تھے۔ ان کی غزل پر غزل اسی وقت کہی، فرماتے ہیں ؎

مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے
سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزوِ ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے

اس کے بعد مشاعرہ ختم ہوا۔ اس مشاعرہ کا ذکر مرزا غالب نے میر مہدی مجروح کو یہ لکھا :-

شاہ فرمان داد و حاجت بارگاہ سخن گستران را ایوانِ نظارت نشان داد کہ روز آدینہ بست و پنجم فروری سنہ بداں خجستہ نشیمن بیائید و جام سخن بریک دگر بپیمائید دگر روز ازشاہزادگان بابریہ وتنے چند از آزادگان شہر فراہم آمدند جا برمردم تنگی کرد۔ گوئی پیکر اندر پیکر ہمی خزید نخست بسلطان الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوق زمزمہ بر تار زدد

غزل سلطان را بجان ندا برخواند که بهره از سپهر فرود آمد پیش شاهزاده یوسف
دیدار ہمایوں آثار۔ مرزا خضر سلطان بہادر غزل طرح بجان سخن سرود که پنداری
پروین بر بساط بزم افشاند۔ مرزا حیدر شکوه و مرزا نور الدین و مرزا حاجی بخت
عالی را ساز سخن بلند آہنگ شد۔ غالب آشفته نوا که بر پہلوی عالی جا داشت
ده بیت از خویشتن خواند۔ مؤمن نام مردے از می آشامان غمکدهٔ صهبائی
نشید مستانه زد۔ مرزا حاجی شهرت کم و بیش ہفتاد بیت در زمین طرح بر سامعه
انجمن نشینان عرضه داد۔ من به بهانه آب تاختن از بزم بیرون آمدم و راه
غمکده گرفتم و در کاشانه گشوده بود و چراغ ہمچنان روشن ہمانا نیمه از شب نگذشته
بود که بر بوریائے بے نوائی دور جام باده روانی داد و باده آشامیدم۔
ختم بامداد بر ... ک ہمایوں روئے آوردم بر چہار سلطان زاده که نام
نامی آنان بر زبان قلم رفت زمزمه شبانه تازه کردند من نیز غزل دیگر
خواندم از ہمدمان شنیده شد که شب بر ہنگامه بسر آمده نزدیک به میدن
سپیده سحر بزم برشکست گویند سلطان الشعرا پایان انجمن دو غزل
از خویشتن سرود اما نه در طرح از ام و زیست“[1]

قلعہ کے ایک مشاعرہ میں غالب اور صہبائی کی ہم طرح غزلیں تھیں۔ "گریبانم نمی آید۔ دامانم نمی آید" طرح ہوئی۔ صہبائی نے یہ غزل پڑھی ؎

نرگس یا رب علاج دردِ ہجرانم نمی آید	شدم خاک و ہنوز آں برق جولانم نمی آید
بنازم پاس ناموس تمنا را که در رویش	سخن تا لب نگہ تا نوک مژگانم نمی آید

---

[1] کلیات نثر غالب صفحہ ۲۳۸

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید

آزردہ بیمار تھے شریک مشاعرہ نہ ہو سکے۔ مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"چوں نوبت بہ من رسید نخوت ملک نخواست، فلک نخواست
سر دوم آنگاہ غزل طرحی خواندم ؎

چہ عیش از وعدہ چوں بادہ زعنوانم نمی آید
بہ نوعے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

شہادت

آفت اس شہر میں قلعہ کی بدولت آئی
وہاں کے اعمال سے دلی کی بھی شامت آئی
روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی

ابو ظفر قلعہ میں بیٹھے کمپنی بہادر کے وظیفہ پر گزران کر رہے تھے۔ انکی ضعیفی سے فائدہ اُٹھا کر نواب زینت محل جانشینی کے ڈورے ڈال رہی تھی کمپنی بہادر کو یہ کانٹا بھی چبھ رہا تھا۔ یکایک ہنگامہ رونما ہوا۔ وطن پرستوں کی بن آئی، آزادیِ وطن کے .... کمر باندھی۔ میرٹھ کے نکالے ہوئے فوجی تلنگے اُن کی ہمنوائی کرنے لگے۔ اُدھر بادشاہ کو آگھیرا۔ پہلے تو وہ بچے مگر دوہائی تہائی سے، اور کچھ حریت نواز شہزادوں کے کہنے سننے سے نئے نئے خواب دیکھنے لگے۔

جنرل بخت خاں روہیلہ بریلی سے آگیا۔ اس کے ساتھ توپخانہ تھا۔

بادشاہ کی پشت پناہی کرنے لگا۔ بادشاہ نے جنرل فوج کا بنا دیا۔ آگے چل کر لارڈ کمانڈر بن گئے۔ جرنل تھا بڑا بہادر۔ اس کے طریقہ کار کے مرزا مغل وغیرہ آڑے آئے۔ نتیجہ تباہی تھا۔ جرنل لکھنؤ گئے۔ مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی کے ہمراہ رہ کر لکھنؤ میں بھی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہی۔ ناکامیابی پر نیپال کے جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔

ابو ظفر رنگون بھیجدیئے گئے۔ جو جو قلعہ سے تعلق رکھتا تھا لپیٹ میں آئے بغیر نہ رہا۔ آزردہ جیل گئے۔ شیفتہ کو بھی قید ہوئی۔ مولانا فضل حق کو انڈمان جانا پڑا۔ وہیں سپرد خاک ہوئے۔ غالب روپوش رہے۔ تو خطرہ سے بچے رہے۔ صہبائی گولی کا نشانہ بنے۔ چنانچہ ظہیر دہلوی کہتے ہیں ؎

جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آبدار ہوئی
سنانِ نیزہ ہر اک سینہ سے دوچار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کا ہار ہوئی
ہر ایک سمت سے فریاد گیرودار ہوئی

ہر ایک دشت قضا میں کشاں کشاں پہنچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا

ہر ایک شہر کا پیر اور جوان قتل ہوا
ہر اک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہلِ زباں خوش بیان قتل ہوا
غرض خلاصہ یہ ہے اک جہان قتل ہوا

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

غرضکہ جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے اُن میں کئی اشخاص باکمال نامی اور فرد روزگار مارے گئے جو دہلی کی ناک اور یگانہ آفاق تھے۔ جن کی نظیر آجتک

لہ داستان غدر صفحہ ۱۲۸

پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔ میاں محمد امیر پنجہ کش خوش نویس جن کا ثانی روئے زمین پر نہیں۔

مولانا امام بخش صہبائی اور اُن کے دو بیٹے اور میر نیاز علی قصہ خواں اور چیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف خاندانی لوگ۔ سنا گیا ہے کہ اُسی محلہ کے چودہ سو آدمی گرفتار کر کے راج گھاٹ کے دروازہ سے دریا پار لے جا کر بندوقوں کی باڑیں مار دی گئیں لاشیں دریا میں پھکوا دی گئیں ؎

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

حضرت اکبر لکھتے ہیں ؎

نوجوانوں کو ہوئیں پھانسیاں بے جرم و قصور
ماردیں گولیاں پایا جسے کچھ زور آور
وہی صہبائی جو تھے صاحبِ قولِ فیصل
ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر[1]

حلیہ | قد میانہ، تمام سر پر بال، رنگ گندم گوں کھلا ہوا۔ دُبلے پتلے۔ منھ پر چیچک کے سے داغ کہیں کہیں تھے[2]

یہ تھی حضرتِ صہبائی کی کہانی۔

آخر میں ان کی درد انگیز شہادت پر ایک مرثیہ ملاحظہ ہو[3]

ندانم کجا رفت آں نعشِ پاک
ملک بردیا ماند بر روئے خاک
ندانم کسے داد او را کفن
دیا ماند چوں سایہ بر خاک تن

---

[1] دیوان اکبر [2] طبقات الشعراء از مولوی کریم الدین دہلوی [3] سفینۂ رحمانی صفحہ ۸۸

ندانم چہ کرد است با او سپہر ؛ زجامہ کفن کرد یا تابِ مہر

بخاکش نمودند او را نہاں و یا مرغ شد سوئے آسماں ؛

کسے فاتحہ ہم بر او خواندہ است بعطرِ گلابی برافشاندہ است

کدامی گل و بلبل و باد و دشت بخاکش بجز بنِ عقیدت گزشت

الٰہی بیامرز مظلوم را کلاہِ شہی دہ بہ ملکِ بقا

بفردوس اعلیٰ بود جائے او

بہشتِ بریں باد ماوائے او عہ

عہ مصنف

دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی

مولانا سید احمد اللہ شاہ دلاور جنگ نواب چینا پٹن کے صاحبزادے ابوالحسن تانا شاہ بادشاہ گول کنڈا کی اولاد سے تھے۔ عالم فاضل اور فنونِ حرب کے ماہر ممالک مشرق و مغرب کی سیاحت کی میر قربان علی جے پوری اور حضرت محراب شاہ قلندر گوالیاری کے مرید و خلیفہ تھے۔ قلندر صاحب نے جان بازی و سرفروشی کی بیعت لی اور انگریزوں کے اقتدار کے خلاف جنگی مساعی کے لئے مقرر کیا۔ دلاور جنگ دلّی آئے۔ پھر آگرہ آ کر قیام پذیر ہو گئے بیعت کا سلسلہ جاری کیا۔ خان بہادر مفتی انعام اللہ شہابی کے یہاں مجلس علما کی تشکیل کی۔ جب ہزارہا مرید ہو چکے ان کو فنونِ حرب سے آگاہ کیا۔ امیر علی شاہ کی شہادت پر لکھنؤ آئے۔ فیض آباد گئے۔ حکومت نے نظر بند کر دیا۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء رونما ہوا جیل ٹوٹی یہ بھی رہا ہو کر معہ محبانِ وطن کے لکھنؤ آئے اور نصف لکھنؤ پر قبضہ کر لیا اور اپنا اقتدار بڑھانا شروع کیا۔ ممّو خاں نے

برجیس قدر کو تخت اودھ پر بٹھایا اور نگراں ملکہ اودھ حضرت محل تجویز ہوئیں۔ افواج کمپنی سے دلاور جناب اور حضرت محل کے خوب خوب مقابلے رہے۔ ممو خاں کی سفلہ پروری اور سنی شیعہ کی پھوٹ نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ مجبوراً حضرت محل شاہجہاں پور روانہ ہوگئیں۔ شاہ صاحب پھر بھی حکومت سے ٹکر لیتے رہے۔ مگر مسلمان اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں تباہی کی راہ لگ رہے تھے۔ شاہ صاحب نے بھی شاہجہاں پور کا رُخ اختیار کیا۔ نواب خان بہادر خاں بریلی بلا رہا تھا پچاس ہزار روہیلہ آپ کے زیر علم رکھنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ لکھنؤ سے شاہجہاں پور گئے۔ محمدی پور میں حکومت اسلامی قائم کی۔ شاہزادہ فیروز وزیر مقرر ہوئے۔ جنرل بخت خاں کمانڈر ہوئے۔ خلافت راشدہ کی اتباع میں حکومت شرعیہ کا نقشہ قائم کیا۔ سکہ شاہ صاحب کے نام کا جاری ہوا۔

سکہ زد بر ہفت کشور خادمِ محراب شاہ
حامی دین محمد احمد اللہ بادشاہ

مگر فیروز شاہ اپنی حکومت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ آخرش یہاں پر بھی زیادہ قیام نہ کر سکے۔ راجہ پوائین بلدیو سنگھ کی دعوت پر گدھی کی طرف تشریف لے گئے۔ ہاتھی پر سوار تھے۔ دھوکہ سے گولیوں کی باڑ سے تواضع کی آخرش آپ نے جام شہادت نوش کیا۔ سر کاٹ کر کوتوالی پر لٹکا یا گیا نعش

ؔ تاریخ احمدی منظوم مولوی فتح محمد تائب لکھنوی و مسلمانوں کا روشن مستقبل از مولانا طفیل احمد مرحوم

ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلادی گئی۔[۱] یہ واقعہ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ کا تھا۔[۲]

سر مبارک کچھ دن بعد مسجد احمد پور محلہ جہاں آباد میں دفن کیا گیا۔ راجہ پوائن کو پچاس ہزار روپیہ انعام دیا گیا۔[۳] تفصیلی حالات "ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما" اور "حیات ولاور جنگ" میں دیکھیے۔

جنرل ٹامس جو ایک بہادر انگریز تھا وہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں شریک رہا۔ اُس نے شاہ صاحب کے متعلق لکھا ہے۔

> مولوی احمد اللہ بڑی لیاقت اور قابلیت رکھتا تھا وہ ایسا شجاع تھا کہ خوف اُس کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ یہ عزم کا پکا اور ارادہ کا مستقل تھا۔ باغیوں میں اس سے بہتر سپاہی نہ تھا۔ یہ فخر اسی کو حاصل ہے کہ اس نے دو مرتبہ سر کالن کمبل کو میدان جنگ میں ناکامیاب رکھا۔ وہ بہ نسبت اور باغیوں کے خطاب شاہ کا زیادہ مستحق تھا۔ اگر محب وطن ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اپنے ملک کی آزادی کے لیے جو غلطی سے برباد ہو گئی ہو سازشیں کی جائیں اور لڑائیاں لڑی جائیں تو مولوی یقیناً اپنے ملک کا محب صادق تھا۔ اُس نے کبھی تلوار کو مخفی اور سازشی قتل سے خون آلود نہیں کیا۔ وہ بہادرانہ اور معززانہ طور پر اُن سے معرکہ آرا ہوا جنھوں نے اس کا ملک چھین لیا تھا۔ دنیا کی ساری قومیں اس کو تعظیم اور ادب کے ساتھ جو شجاعت و صداقت کے لیے لازمی

---

۱ رسالہ معارف علی گڑھ ۲ قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۶۷ ۳ صحیفہ زریں۔ [۴] نمونہ ونکشور

ہیں اور جن کا مولوی مستحق تھا اس کو یاد کریں گی "

یہ ایک آزاد، حکمراں اور بہادر قوم کے ایک شریف جرنیل کے قیمتی الفاظ ہیں ۔[1]



[1] تاریخ شاہجہاں پور صفحہ ۱۳۹

۱

حضرت مولانا فضل حق فرقتی خیرآبادیؒ

علامہ فضل حق متخلص فرقتیؔ خیرآبادی کے والد مولانا فضل امام بن شیخ ارشد
ہر گامی نسباً فاروقی تھے فضل وکمال کے ساتھ منطق وفلسفہ میں تبحر خاص تھا۔
دلّی میں صدر الصدور کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ باپ
دادا کا طریقہ بھی جاری تھا منتہی طلبار کو بالخصوص علوم معقول کا درس دیتے
"مرقات" حاشیہ "افق المبین" یادگار ہے ہے۔ بسنہ ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا۔

سنہ ۱۲۱۲ھ میں علامہ فضل حق پیدا ہوئے۔ باپ سے جملہ علوم وفنون کی تحصیل
کی سند حدیث مولانا شاہ عبد القادر دہلویؒ سے لی۔ ۱۴ سال کی عمر میں
فارغ التحصیل ہوگئے اور باپ کے تلامذہ کو درس دینے لگے۔

ایک طالب علم مولانا فضل امام سے پڑھنے آیا، آپ نے فرمایا کہ میاں
جاؤ فضل حق سے سبق لے لیا کرو۔ وہ ان کے پاس آیا۔ غریب آدمی بدصورت
عمر زیادہ۔ علم کم۔ ذہن کند۔ یہ نازک طبع، نازپروردہ جمال صورت ومعنی سے آراستہ

---

۱ سیر العلما۔ ۲ مولانا فضل حق۔ عبد الحق خیرآبادی مطبوعہ مجلس مصنفین علی گڑھ

چودہ برس کا سن و سال ، نئی فضیلت ، ذہن میں جودت ! بھلا میل ملے تو کیسے ملے ۔ صحبت راس آئے تو کیوں کر آئے تھوڑا سبق پڑھایا تھا کہ بگڑ گئے ۔ جھٹ اُسکی کتاب پھینک دی ۔ برا بھلا کہہ کر نکال دیا ۔ وہ روتا ہوا مولانا کے پاس پہونچا ۔ اور سارا حال کہہ سنایا ۔ فرمایا بلاؤ اس خبیث کو ۔ مولوی فضل حق آئے ۔ دست بستہ کھڑے ہو گئے ۔ مولانا نے ایک تھپڑ دیا اور ایسے زور سے کہ اُن کی دستارِ فضیلت دُور جا پڑی پھر فرمانے لگے کہ تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا ۔ ناز و نعم میں پرورش پائی جس کے سامنے کتاب رکھی اُس نے خاطر داری سے پڑھایا ۔ طالب علموں کی قدر و منزلت کو تو کیا جانے ۔ اگر بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو تو حقیقت معلوم ہوتی ۔ طالب علم کی قدر ہم سے پوچھ ؎

درازیٔ شب از مژگانِ من پرس ۔ کہ یک دم خواب در چشم نگشت است[1]

ملازمت اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا ۔ دلی میں ریذیڈنٹ رہا کرتا تھا ۔ اس کے محکمے کے سررشتہ دار ہو گئے ۔ ابو ظفر ولی عہد سے دوستانہ مراسم تھے قلعہ میں آتے جاتے ۔ دلی وہ دلی تھی کہ ایک طرف حدیث و فقہ کا دور دورہ دوسری طرف منطق و فلسفہ کی گرم بازاری ۔ شعر و سخن کے گلی کوچہ میں چرچے بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر موجود ۔ اُن کے ہم سبق مفتی صدر الدین خاں آزردہ دوستوں میں مولوی امام بخش صہبائی ۔ علامہ عبد اللہ خاں علوی ۔ حکیم مومن خاں مومن ۔ نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب ۔ نواب ضیاء الدین خاں نیر ۔ شاہ نصیر الدین نصیر ۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق ۔ حکیم آغا جان عیش ۔ حافظ عبد الرحمن احسان ۔ میر حسین تسکین

[1] منقول مولانا غوث علی شاہ قلندر (تذکرہ غوثیہ)

سے باکمال لوگ تھے شام کو مولانا کے یہاں نشست رہا کرتی لہ

علاّمہ فضل حق..... بزرگوں کے وطن کے لحاظ سے اُن کو خیرآبادی کہہ لو۔ مگر حقیقت میں اُن کا بچپن، جوانی، بڑھاپا سب دلّی میں گذرا۔ مرزا غالب آگرہ سے دلّی آن رہے تو اُن سے مراسم پیدا ہوئے اور رفتہ رفتہ بڑھ گئے یہانتک کہ مرزا اُن کو اپنا مخلص بے ریا سمجھنے لگے۔

مناظرہ | مولانا محمد اسمٰعیل شہید ابن مولوی عبدالغنی بن حضرت ولی اللہ دہلوی علاّمہ سے بیس سال بڑے تھے۔ علوم منقول ہی میں نہیں بلکہ معقول میں بھی انھیں اجتہادی درجہ حاصل تھا۔ بدعات و محدثات کے خلاف آواز اٹھائی علمائے دین بھڑک اُٹھے۔ علاّمہ بھی اُن کے آگے آگے تھے۔ کبھی اکبر شاہ ثانی کو ابھارا۔ مگر شہید کی حق گوئی نے بادشاہ کی زبان بھی بند کردی۔ آخر مناظرہ کی ٹھنی۔ ایسا بازار گرم ہوا جس کا سلسلہ ہندوستان میں برسوں جاری رہا۔

امتناع نظیر، امکانِ نظیر کا مسئلہ رفع یدین آمین بالجہر کی بحثیں چھڑ گئیں۔ ہر دو اُلجھتے ہی رہے۔ دونوں میں تحریری مناظرہ ہوا کرتا۔ ایک مرتبہ علاّمہ اور حکیم مومن خاں شطرنج کھیل رہے تھے۔ کوئی اعتراض دماغ میں آگیا۔ اسی وقت آدمی کو لکھکر دیا جاؤ۔ مولانا سے جواب لاؤ۔ وہ گیا۔ حضرت شہید کسی کام میں تھے۔ خادم واپس آگیا۔ شطرنج سے آنکھ اٹھاکے پوچھا جواب لائے۔ وہ بولا ابھی جواب نہیں لکھا ہے۔ تحریر دے آیا ہوں۔ مسکراکے بولے "بس ہولیا جواب" یہ بات

لہ گل رعنا صفحہ ۳۱۲ ۔ امیر الروایات از امیر شاہ خان

حکیم مومن خاں کو بری لگی۔ حکیم صاحب اور شید پیر بھائی اور ہم عقیدہ تھے۔ کہنے لگے وہ بات ہی ایسی کیا ہے جس کا جواب مولانا محمد اسمٰعیل نہ دے سکیں۔ اس پر ہر دو میں بحث بہت خوب رہی۔ ہر دو کے مزاج برہم سے ہونے لگے۔ حکیم صاحب نے یہ رنگ دیکھکر بساطِ شطرنج تہ کی اور چلتے ہوئے یہ شعر پڑھا ؎

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال دیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

علامہ فرقتی اور آزردہ ہر دو تخلص رکھتے تھے۔ دو ایک دن بعد یاد آئی حکیم صاحب کے گھر گئے اور دوست کو منا لائے۔ انھوں نے فی البدیہہ کہا۔

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

علامہ نے ایک دن مرزا غالب سے کہا حضرت نہ روزہ کے ہو نہ نماز کے کچھ تو آخرت کے لئے نیکی کا کام کر لو۔ موقعہ اچھا ہے۔ لگے ہاتھوں ثواب لے لو۔ وہ مسکرائے اور کہا فرمائیے کیا کام ایسا ہے۔ آپ نے کہا فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھدو۔ جس میں ان کے بڑے بڑے اور مشہور عقیدوں کی تردید اور خاصکر مولوی شاہ محمد اسمٰعیل کو مخاطب کر کے امتناع ختم النبیین کے مسئلہ کو زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کرو۔ اس مسئلہ میں شاہ صاحب کی یہ رائے تھی کہ ختم النبیین کا مثل ممتنع بالذات اور ممتنع بالغیر ہے۔ ممتنع بالذات نہیں ہے یعنی آنحضرت صلعم کا مثل اس لئے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے۔ نہ اس لئے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ برخلاف

اس کے خلاف علامہ کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے۔ اور جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا اس طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ مرزا صاحب نے مثنوی لکھ ڈالی۔ جو کلیات میں مثنویات کے سلسلہ میں چھٹی مثنوی ہے۔

علامہ مثنوی دیکھ کے خوش نہیں ہوئے بلکہ چراغ پا ہو گئے۔ مرزا کو نہ شاہ صاحب سے خصومت تھی اور نہ اُن کے مخالفوں سے تعلق بلکہ صرف دوست کی رضا جوئی مقصود تھی۔ چنانچہ علامہ کے کہنے سننے سے کچھ اور اشعار کا اضافہ کر کے دوست کو رضا مند کر لیا۔[1]

جھجر کی روانگی عرصہ کے بعد ریزیڈنسی کمشنری میں اپنے آپ کو تبدیل کرا لیا مگر یہاں بھی رنگ بے رنگ تھا۔ یہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے۔ حکام بھی تنک مزاج۔ حفظ مراتب کہاں۔ ارباب علم اور بے علم سب ایک آنکھ دیکھے جاتے۔ علامہ نے استعفےٰ دیا۔ نواب فیض محمد خاں رئیس جھجر نے پانصد روپیہ ماہوار مصارف کے لئے پیش کیا اور وقار روانی کے ساتھ اپنے پاس بلایا۔ روانگی کے وقت ولی عہد سلطنت صاحب عالم مرزا ابو ظفر بہادر نے اپنا ملبوس دوشالہ علامہ کو اُڑھا دیا اور بوقت رخصت آبدیدہ ہو کے کہا چونکہ آپ جانے کے لئے تیار ہیں۔ میرے لئے بجز اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کر لوں۔ مگر خدا علیم ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۱

ایک عرصہ تک جھجر رہے۔ پھر مہاراجہ نے بلوالیا۔ کچھ دنوں بعد سہارنپور قیام رہا۔ نواب ٹونک کے پاس بھی رہے۔ نواب یوسف علی خاں نے رام پور بُلالیا۔ خود تلمذ اختیار کیا اور محکمۂ نظامت اور مرافعہ عدالتوں میں منسلک کردیے گئے نواب کلب علی خاں نے بھی کچھ آپ سے پڑھا۔ آٹھ دس برس رہنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں صدر الصدور ہوگئے[1]

مولوی رحمٰن علی خاں تذکرہ علمائے ہند میں اپنا مشاہدہ لکھتے ہیں کہ میں نے ۱۲۶۴ھ میں بمقام لکھنؤ مولانا کو دیکھا کہ حقہ نوشی کی حالت میں شطرنج بھی کھیلتے جاتے تھے۔ اور ایک طالب علم کو افق المبین کا درس اس خوبی سے دیتے تھے کہ مضامین کتاب طالب علم کے ذہن نشین ہوتے جاتے تھے۔[2]

ادیب

فضل وکمال وعلمی حیثیت سے علامہ جس قدرومنزلت کے شخص تھے اس کی نظیر ہندوستان میں مشکل سے ملے گی۔ علوم معقول کے تو امام تھے ہی۔ علم ادب جو عربیت کا بڑا جوہر ہے۔ اس میں وہ کمال پایا کہ عرب کے معاصر شعرا سے گوئے سبقت لے گئے۔ علامہ کو عربی نظم پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ چار ہزار سے زائد اشعار کہے۔ مولانا غوث علی شاہ قلندر واقعہ بیان کرتے تھے کہ علامہ نے ایک قصیدہ عربی میں امرألقیس کے ایک قصیدہ کی طرز پر لکھا اور مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کو سنانے کے لئے گئے۔ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں انھوں نے بیس شعر متقدمین کے پڑھ دیے۔ مولانا فضل امام بھی اس وقت وہاں موجود تھے وہ فرمانے لگے

---

[1] انتخاب یادگار منشی امیر احمد امیر مینائی صفحہ ۲۶۱ [2] تذکرہ سیر العلماء مرتبہ حکیم بہاء الدین صدیقی گوپاموی

کہ بس حد ادب، علامہ نے جواب دیا کہ حضرت یہ کوئی علم تفسیر و حدیث تو ہے نہیں فن شاعری ہے۔ اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ برخوردارم تم سچ کہتے ہو مجھکو سہو ہوا[1]۔

علامہ عربی کے سوا فارسی میں بھی فکر سخن کرتے تھے۔ فرقتی تخلص تھا۔ یہ شعر نقل ہے[2]

فرقتی در کعبہ رفتی بار ہا — نامسلماں نامسلمانی ہنوز[3]

ظرافت طبع مولانا بایں علم و فضل خشک طبیعت نہ رکھتے تھے۔ زندہ دلی رنگین طبیعت تھی۔ سرکاری ملازم ہونیکی وجہ سے جب ڈاڑھی سفید ہونے کو آئی تو خضاب لگانے لگے۔ ان کے ایک مولوی دوست کو اس پر سخت اعتراض تھا اور وہ ہمیشہ مولانا سے کہا کرتے کہ آپ خضاب کیوں لگاتے ہیں۔ مولانا ہمیشہ اپنے مولوی دوست کا یہ اعتراض سنکر خاموش ہو جاتے۔ لیکن ایک دن ضبط نہ ہو سکا تو کہنے لگے کہ مولوی صاحب کوئی دنیا کمانے کے لئے مسجد میں مولوی بن کر بیٹھتا ہے۔ کوئی پیری مریدی کرتا ہے۔ کوئی لوگوں کو تعویذ لکھکر دیتا ہے میں بھی آخر دنیا دار ہوں۔ دنیا کمانے کے لئے مریدوں اور غریبوں کی جیب نہیں کاٹتا۔ صرف اپنا منہ سیاہ کر لیتا ہوں۔ مولوی صاحب جو فی الحقیقت پیر جی بھی تھے فال و تعویذ والے بھی۔ اس جواب سے بہت منفعل ہوئے[4]۔

---

[1] تذکرہ غوثیہ از مولانا گل حسن شاہ پانی پتی [2] گلزار بہار صفحہ ۱۱۴ [3] ریاست اخبار دہلی ۲۵ - جنوری سنہ ۱۹۳۲ء

مولانا پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری راقم السطور سے یہ واقعہ بیان فرماتے تھے کہ علامہ لکھنؤ میں صدر الصدور جس زمانہ میں تھے منشی نولکشور نے مولانا سے عرض کیا کہ فرصت کے اوقات میں عربی کتب کی کاپی کو ملاحظہ فرمالیا کریں تو عین بندہ نوازی ہو۔ مولانا نے از راہِ اخلاق منظور کر لیا۔ اس وقت مجتہد العصر کی ایک مناظرہ کی کتاب مطبع میں طبع ہونے آئی۔ اسکی کاپیاں تصحیح کے لئے آپ کی خدمت میں آئیں۔ تصحیح بھی عبارت کی کرتے جاتے۔ حاشیہ پر اعتراضات کا جواب بھی لکھتے جاتے۔ جب کتاب چھپکر مجتہد العصر کے پاس گئی تو کتاب دیکھ کے سر پیٹ لیا۔ کہ تمام عمر کی کمائی برباد گئی اور منشی نولکشور سے دریافت کیا تو اصلی واقعہ انھوں نے کہدیا۔ آخرش کتابوں کے انبار میں آگ لگوادی گئی[1]

بیعت مولوی فیض الحسن کہتے تھے کہ میرے استاد مولوی فضل حق رام پوری کا بیان ہے کہ علامہ فرماتے رہتے تھے کہ میں حضرت مجدد صاحبؒ کے سلسلہ کا زیادہ معتقد نہ تھا۔ لیکن جب سے میں نے شاہ عبد القادرؒ کو دیکھا اس سلسلہ کا بہت معتقد ہو گیا۔

کیونکہ اگر وہ سلسلہ فی الحقیقت ناقص ہوتا تو ایسے لوگ اس سلسلہ میں میں داخل نہ ہوتے[2]۔ چنانچہ آپ حضرت شاہ دھومن دہلویؒ کے مرید ہو گئے[3] اس کے بعد سے ہی ریاضت و مجاہدہ اختیار کیا۔

فضلائے ہند مرتبہ انتظام اللہ شہابی و داستان تاریخ اردو مرتبہ پروفیسر حامد حسن قادری

[2] امیر الروایات صفحہ ۳۰ [3] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۱۶۴

موجودہ انتخاب دیوانِ غالب مولانا جس زمانہ میں دلّی میں سرشتہ دار تھے اُس وقت مرزا خانی کوتوال شہر تھے۔ یہ تھے مرزا قتیل کے شاگرد نثر و نظم میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ ان ہر دو باکمالوں سے اور مرزا غالب سے دلی دوستی تھی ہمیشہ باہم دوستانہ جلسہ اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ مولانا آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں۔

"انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا خیر ہوا سو ہوا۔ انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جسے آج عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں[1]"

مگر اس واقعہ کو مولانا حالی یادگار میں چبا سا گئے۔ لکھا ہے مگر ان الفاظ میں نہیں۔

سیاست علامہ ایک حکیمانہ دماغ لے کے آئے تھے۔ قوم میں اضمحلال آنکھوں دیکھتے آیا۔ اکبر شاہ ثانی کا عہد دیکھا۔ بہادر شاہ کا زمانہ پایا۔ انگریزی حکومت کے معزز عہدوں پر سرفراز رہے۔ شاہ امیر علی امیٹھوی ہنومان گڑھی کے مہنتوں کی سرکوبی کو آمادہ ہوئے۔ اور ان کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ یہ لکھنؤ میں صدر الصدور تھے تو نواب اودھ کا ساتھ دیکر شاہ صاحب

---

[1] آبِ حیات صفحہ ۵۲۱

کو سمجھاتے بجھاتے رہے۔ آخرش شاہ صاحب نے نواب اودھ کی فوج کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔ یہ واقعہ تازیانۂ عبرت تھا۔ ادھر دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی آگرہ سے لکھنؤ آئے تو آپس میں ملے جلے۔ رنگ کچھ اور ہی ہو گیا۔ دلاور جنگ فیض آباد گئے یہ الور چلے گئے ایک سال بعد ہنگامہ ۱۸۵۷ء رونما ہوا مولانا دلّی آئے فتویٰ لکھا۔ جنرل بخت خاں سے ملے۔ مگر سب تدبیریں اُلٹی پڑیں۔ وہاں سے وطن چلے آئے۔ بادشاہ دلّی رنگون روانہ کئے گئے۔

۱۸۵۹ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا ماخوذ ہو کر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا مولانا موصوف کے فیصلہ کے لئے جیوری بیٹھی۔ ایک اسیسر نے واقعات سنکر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے۔ بلکہ لطف یہ تھا کہ جب الزام اپنے اوپر خود قائم کئے۔ اور پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی و قانونی اوڑ سے توڑ دیئے۔ جج یہ رنگ دیکھکر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ کرے تو کیا کرے۔ ظاہر یہ ہو گیا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے سرکاری وکیل لاجواب تھے۔ چنانچہ پیر کا مقدمہ منشی کرم احمد خیرآبادی نے لکھنؤ سے سید اعظم علی خیرآبادی کے نام خیرآباد یہ خط لکھا۔

"مدّت یک دو روز است کہ جناب مخدوم و الاخوال حسب تقدیر مبتلائے حبس شدہ از سیتاپور بہ لکھنؤ برائے روبکاری صفائی روانہ کردہ

---

[1] تاریخ اودھ از حکیم نجم الغنی رامپوری۔ آبکاری

شده اند۔ رہائی آئندہ ہر گاہی ہم از تحریرات اخبار روزہ منکشف میشود
کہ ام وز فردا بفضلہ تعالیٰ رہائی خواہد شد۔ روز بنا برادائے شہادت
صفائی مولوی صاحب مکرم مولوی نبی بخش صاحب (خیر آبادی اقم السطور
کے پھوپھا) مشفقی مولوی قادر بخش صاحب و برخوردار مولوی سید ضامن حسین
بموجب درخواست (شمس العلماء) مولوی عبد الحق بمعیت الشان روانہ
لکھنؤ شدہ اند و ہمگیان را امید از خدائے کریم است دیگر روز بالضرور
مخلصی یافتہ دارد، دولت خانہ خواہد شد او تعالیٰ ہمچنیں کند ہمہ ہا از خورد
وکلاں و ذکور و اناث چشم براہ انتظار کشادہ میباشند و رنج و قلقے عظیم
دارند ایزد جل و علیٰ بر جمیع کساں رحم خود فرمائید"

دوسرے دن آخری دن تھا۔ آپ نے اپنے اوپر جس قدر الزام کیے
تھے ان کو ایک ایک کرکے رد کیا۔ اور جس مخبر نے فتوے کی خبر کی اس کے بیان
کی توثیق و تصدیق کی۔ اور فرمایا پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا۔ اور رپورٹ
بالکل صحیح لکھوائی تھی۔ اب عدالت میں میری صورت دیکھ کے مرعوب سا ہو گیا او
جھوٹ بولا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے۔ اور آج اس وقت بھی میری
وہی رائے ہے۔ چنانچہ اس کے بعد بھی بے حد رنج کے ساتھ عدالت نے
حبس دوام کا حکم سنایا۔ آپ نے مسرت سے منظور کیا۔ یہ جج آپ سے کام سیکھ
چکا تھا۔ مذکورہ خط میں اس کا ذکر اس طرح سے ہے۔

"برادر من تا دہ عشرہ بسبب عدم بہمرسی حامل ایں لفافہ افتادہ ماند
حالیہ آدمی خاص مقرر کردہ فرستادہ می شد کہ جواب شافی یا بد بحال

پرملال جناب مولوی (فضل حق) صاحب از لکھنؤ دریں عرصہ نوشتہ آمد
لائق گریستن و واویلا کردن است یعنی حبس دوام از پیشگاہ حکم صدور یافت
فوا ویلاہ وا حسرتاہ او تعالیٰ رحم فرماید۔ [۱]

محرر بست و ہشتم فروری مطابق ۱۷۔ رجب ۱۲۷۵ھ

انڈمان پہونچے استاذنا مولانا محمد عمر انصاری بخاری اکبرآبادی اپنے استاد کی زبانی کہتے تھے کہ مولانا کو خدمت ذلیل درجہ کی دی گئی تھی۔

جیل سپرنٹنڈنٹ ایک شریف انگریز تھا مشرقی علوم سے واقف اور فن ہیئت کا ماہر تھا۔ اس کی بیٹی میں ایک سزا یافتہ مولوی بھی تھے۔ اپنی تصنیف کتاب ہیئت کی جو فارسی میں تھی۔ وہ ان کو دی کہ عبارت صحیح و درست کر دیں مولوی صاحب سے تو کام چلا نہیں۔ علامہ نئے نئے گئے تھے۔ ایک سال ہی گذرا تھا ان کو وہ کتاب دی اور کہا مولانا آپ اس کو درست کر دیں۔ چنانچہ علامہ نے اس کی عبارت درست کی۔ اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ کر دیا۔ اور حاشیہ میں کثیر التعداد کتب کے حوالے لکھے۔ جب یہ کتاب مولوی صاحب سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس لے گئے وہ دیکھکر حیران و ششدر رہ گیا۔ اور اس نے کہا مولوی صاحب تم بڑا لائق آدمی ہے۔ مگر جن کتابوں کے حوالہ ہیں اور ان کی عبارتیں جو نقل ہیں یہاں کہاں ہیں۔ مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ علامہ کا کہہ سنایا۔ وہ اس وقت مولوی صاحب کو لے کر بارگ میں آیا۔ علامہ تھے نہیں کچھ انتظار کے بعد دیکھا تو کرا بغل میں دبائے چلے آرہے ہیں۔ وہ یہ ہیئت دیکھ کے آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور معذرت کی اور کلرکی میں لے لیا اور گورنمنٹ

میں امن کی سفارش کی۔ ادھر علامہ کے صاحبزادہ مولوی شمس الحق دہلوی اور علامہ کے قریبی عزیز خان بہادر مفتی انعام اللہ گوپاموی کے داماد منشی خواجہ غلام غوث بےخبر خاں بہادر ذوالمقدر میر منشی لفٹنٹ مغربی و شمالی صوبہ اودھ سرگرم سعی تھے پروانۂ آزادی حاصل کیا اور مولوی شمس الحق انڈمان روانہ ہوگئے۔ وہاں جہاز سے اُترے شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا اس کے ساتھ بڑا اژدہام تھا۔ انھوں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ کل ۱۲؍ صفر المظفر ۱۲۷۸ھ کو علامہ کا انتقال ہو گیا۔ اب سپرد خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی ہمراہ ہو گئے اور بعد دفن و فاتحہ وطن بصد حسرت و یاس لوٹے۔

چند عربی شعر قصیدۂ نعتیہ سے نقل ہیں ؎

هو اول الانبیاء آخرهم به	ختم النبوة وابتداء الابداء
وہ پہلا نبی ہے اور آخر انبیا ہے	اس پر تمام ہوئی نبوت اور اس سے شروع ہوئی
قد خصه الباری باوصاف علے	لم یعطها الاحداث والقدما
خاص کیا اسکو اللہ تعالیٰ نے ساتھ بڑے صفوں کے	کہ نہیں دیے وہ اوصاف پچھلوں اور اگلوں کو

تصانیف الجنس الغالی شرح جواہر العالی۔ شرح تہذیب الکلام۔ تحقیق حقیقۃ الاجسام۔ حاشیہ قاضی مبارک۔ حاشیہ افق المبین۔ حاشیہ تلخیص الشفا۔ ہدیہ سعیدیہ فی الحکمت الطبیعہ روض المجود فی تحقیق الوجود۔ رسالہ بحث قاطیغوریاس۔ رسالہ تحقیق علم و معلوم رسالہ غدر۔ اور ان تصنیفات کے علاوہ خطب اور قصائد عربی شمار میں سو سے زائد ہیں۔[1]

---

[1] تذکرۂ مصنفین از مولوی اکرام اللہ شہابی گوپاموی

حضرتِ آزردہ دہلوی

مفتی صدر الدین خاں آزردہ ابن مولوی لطف اللہ کشمیری نجابت و شرافت کے اعتبار سے امتیازی درجہ تھا۔ ان کے اجداد دہلی میں آکر مقیم ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا ۱۲۰۴ھ میں آزردہ پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت لفظ "چراغ" سے نکلتی ہے۔ دلّی اہلِ علم کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ مولوی صاحبؒ نے خود ابتدائی کتابیں پڑھائیں۔ علومِ عقلیہ کی تحصیل مولانا فضل امام خیرآبادی صدر الصدور دلّی سے کی۔ حدیث حضرت شاہ عبدالقادرؒ سے پڑھی۔

مولوی فضل حق اور آزردہ ہم سبق تھے۔ مولانا فضل امام سے منطق و فلسفہ کا درس لے رہے تھے۔ ایک بنگالی طالب علم بھی وہاں آگیا۔ اور مولانا سے بولا آپ کا نام سن کے دُور سے آرہا ہوں۔ آپ نے اشارہ سے ایک جانب بیٹھنے کو کہا۔ جب پڑھا چکے مخاطب ہوئے۔ طالب علم بولا آپ سے مجسطی اقلیدس پڑھنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا میاں میری رائے میں مولوی شاہ عبدالقادر کے درس میں جا بیٹھو۔ وہاں تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔

طالب علم یہ سن کے ہکا بکا رہ گیا۔ سر جھکا کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ دوپہر کا کھانا محلسرا سے آیا۔ شام ہوئی۔ مولانا صدر الصدوری کا کام انجام دے کر گھر آئے۔ فواکہات کا شغل کیا۔ نماز عصر سے فارغ ہو کر محلسرا سے باہر آئے۔ مفتی صدر الدین خاں اور مولانا فضل حق آن بیٹھے۔ سبق ہونے لگا حسن اتفاق سے درس میں مجسطی کا ہی سبق تھا۔ ادھر ملنے جلنے والے آگئے۔ بنگالی اپنی جگہ سے اٹھا درس میں آبیٹھا اور یہ رنگ دیکھتا رہا۔ احباب بات چیت کرکے سدھارے مولانا سے آنکھوں میں آنسو لائے بولا۔ حضور مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی کہ مجھکو ٹالا جاتا تھا۔ حضور مجسطی پڑھا رہے تھے۔ مجھے حکم ہے شاہ صاحب کے پاس جاؤں۔ مولانا مسکرا دیئے۔ کہنے لگے میاں مجسطی ہر کوئی مدرس پڑھا سکتا ہے۔ مگر شاہ صاحب اس طرح پڑھاتے جیسے حکیم بطلیموس صاحب مجسطی پڑھاتا۔ تمہاری خوشی ہے مجھسے ہی پڑھ لیا کرو کل سے آجانا۔

آزردہ فارغ التحصیل ہو کے کلکتہ جانے لگے تو حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے کلکتہ کے ایک مدرسہ کے مہتمم مولانا امین اللہ کے نام ایک خط دیا جس میں تعارف اس طرح کرایا۔

دریں ولا مولوی صدر الدین صاحب کہ از فضلائے نامدار ایں بلدۂ ما ہلولہ اند و در اکثر فنون عقلی و نقلی از عربیت و ادب و اصول و فقہ و کلام و ہم فنون فارسی مہارت تام دارند و اکثر مراجعت تحقیقات بنفسہ علوم در فقیر خانہ نمودہ اند و معہذا نسبت ارادت و اتحاد با فقیر موروثی دارند و جد ایشان از فضلائے معتبر و

ۂ وقایع ادب

خلص اصحاب و تلامذہ در جناب حضرت والد ماجد فقیر بودند۔

القوم اخون صدق بينهم سببٌ
من المودة الّم يعدل به النسبٗ

عازم دار الامارت کلکتہ بتقریبات چند در چند اند۔ انشاءاللہ تعالیٰ ملاقات سامی خواہند نمود۔ مراعات جہات مذکورہ در حسن تلقی و اعزاز و اکرام ایشان ہما لکن مد نظر سامی باشد“۔

ملازمت — ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے عہدہ الصدوری عطا ہوئی۔

مدرسہ کا قیام — شاہجہانی عہد سے زیر جامع مسجد مدرسہ دار البقا چلا آرہا تھا وہ سلطنت کی تباہی کے ساتھ برباد ہوا۔ مفتی صاحب نے اپنے روپے سے دوبارہ بنوایا۔ عمارت درست کرائی۔ درس و تدریس کا اہتمام کیا۔ اساتذہ اور طلبا کو اپنے پاس سے تنخواہ و وظیفہ دیتے۔ منتہی طلبا کو عدالت کے کام سے فارغ ہو کے اسباق خود پڑھاتے اور تعطیل کے دن سب کو لے کر خود باغات کی سیر کراتے ہوئے اور لذیذ کھانے کھلاتے تھے۔

جناب آزردہ نے نواب مصطفٰی خاں کو اپنے مشاغل کے متعلق ایک خط لکھا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

شکر ہے اس پروردگار عالم کا جس نے مجھکو ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اس میں غرق آب تھا نکالا۔ کیسے علائق میں جکڑبند تھا کہ نکلنا اس سے سوائے اسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ

خفا۔ مقدمات اصلی کا فیصل کرنا منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات
کا مرافعہ سننا۔ رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا۔ مقدمات کے دوران میں فتویٰ
دینا۔ کمیٹیوں میں حاضر ہونا۔ طلباء مدرسۂ سرکاری کا امتحان ماہواری
لینا۔ احکام آخر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا۔ ہزارہا کاغذات پر دستخط کرنا۔
پھر گھر میں اکثر طالب علموں کو پڑھانا اور اطراف و جوانب کے سوالات
شرعی کا جواب لکھنا۔ وہابیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حکم ہونا۔
مجلس شادی و غمی اور اعراس میں جانا۔ شعر و شاعری کی صحبت گرم رکھنا
باغات کی سیر اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا[1]

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مفتی صاحب محکمۂ نزول کے کام میں اتنے مشغول ہوئے
کہ درس کے لئے کوئی وقت نہ نکال سکے۔ کئی دن تک درس بند رہا۔ طلباء
سخت پریشان ہوئے۔ آخر ایک منچلے شاگرد نے جرأت کر کے ایک نظم لکھی۔
جس کے اس شعر سے اس واقعہ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

ہاتف بدست چپ سر بینی فشردہ گفت
بیماری نزول بہ صدر الصدور شد

اس نظم کا اثر یہ ہوا کہ مفتی صاحب نے درس کا سلسلہ شروع کر دیا۔
مرزا غالب نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع
یہ ہے۔

ذاں نمی ترسم کہ گردد قعر دوزخ جائے من
وائے گر باشد ہمیں امروز من فردائے من

[1] معارف نمبر ۵ جلد ۲

صدرِ دیں و دوست و صدرالصدورِ روزگار
میرو مخدوم و مطاعِ والی و مولائے من!

ادبی ذوق

دلّی میں ان دنوں شعر و شاعری کی گرم بازاری تھی۔ دلّی اس وقت آج جیسی دلّی نہ تھی۔ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر و اہلِ علم حکیم مومن خاں مومنؔ۔ مولوی امام بخش صہبائیؔ۔ علامہ عبداللہ خاں علوی۔ نواب ضیاء الدین خاں نبیرۂ شاہ نصیر الدین نصیرؔ سلطان الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ۔ حکیم آغا جان عیشؔ۔ حافظ عبدالرحمٰن احسانؔ۔ میر حسین تسکینؔ، عارفؔ، محو۔ صابرؔ۔ عالی وغیرہ کثیر التعداد شعرا تھے عموماً ان کے یہاں شب کی صحبت رہتی۔

مفتی صاحب اور شیفتہ کے یہاں ہر ہفتہ باری باری مشاعرہ ہوتا۔ اہلِ کمال اس میں شریک ہو کے لطفِ سخن اٹھاتے۔

مولانا فضل حق تعلیم کے بعد دلّی میں رہ گئے۔ مرزا غالبؔ آگرہ سے دلّی گئے۔ وہ بھی اس جماعت میں گھل مِل گئے۔

مرزا صاحب نوابی دماغ رکھتے تھے۔ فضول خرچیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ قرض ادھار کا دائرہ وسیع تھا۔ ایک قرضخواہ نے مرزا پر دعویٰ کر دیا اور یہ مقدمہ مفتی صدر الدین خاں کے اجلاس میں پیش ہوا۔ مرزا جب جواب دعوے کے لئے پیش ہوئے تو فرماتے ہیں۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب مسکرا دئے اور اپنے پاس سے دوست کی خاطر روپیہ بھرا۔ اور مقدمہ سے غالب کو نجات ملی

علم و فضل

حکیم عبد الحی مرحوم گل رعنا میں لکھتے ہیں۔

جناب آزردہ مرحوم ان چند اشخاص میں سے تھے جنہوں نے اعلیٰ درجہ کی جامع قابلیت و فضیلت کے باوجود ملک میں بھی اپنی علمی استعداد کا سکہ بٹھا دیا۔ آپ اپنے زمانے کے مشاہیر میں سے تھے اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے[1]

علمار کی مجلس ہو تو صدر نشیں، مشاعرہ ہو تو میر مجلس حکام کے جلسوں میں موقر و ممتاز بیکسوں اور محتاجوں کے ملجا و ماویٰ منصب اعلیٰ پر ممتاز و حکام رس ہونے کے باوجود آپ کی طبیعت ظاہری نمائش سے کوسوں دور تھی۔ دنیاوی آسائش کے تمام سامان بہم ہوتے ہوئے خود سیدھی سادی وضع سے بسر کرتے تھے[2]

سیاسی مسلک

مفتی صاحب سرکاری آدمی تھے۔ اختر لونی کی ہمراہی میں ریاستوں کے معاملات بھی سلجھا چکے تھے۔

اتفاقیہ دلاور جنگ مولوی احمد اللہ مدراسی دلی آنکلے۔ وہ شیخ طریقت تھے۔ مفتی صاحب ایک ولی سمجھ کر اُن سے ملے تھے۔ وہ مجاہد آدمی، مفتی صاحب بھی ان کے کچھ ہم خیال ہو گئے۔ معاصرین علما و فقرا آتے۔ کوئی توجہ نہ کرتے دلاور جنگ آگرہ چلے گئے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء رونما ہوا مولانا فضل حق الوری آئے۔ جرنل بخت خاں نے نقشہ اقتدار کا جما رکھا تھا۔ استفتا مولانا نے لکھا مفتی صاحب و دیگر علمار نے فتویٰ دیا[3]۔ مگر یہ سب تدبیریں بے سود تھیں۔ عصبیت قومی مردہ تھی۔

بہادر شاہ رنگون روانہ کئے گئے۔ ان علماء پر بھی مصائب کا پہاڑ ٹوٹا۔ مولانا فضل حق کو اقرارِ جرم کرنے پر انڈمان جانا پڑا۔ مفتی صاحب جیل میں بند کئے گئے۔ مولانا نذیر حسین محدّث و مولوی عبد القادر وغیرہ بھی قید ہوئے۔ مگر مسٹر منس کی سفارش سے یہ لوگ چھوٹ گئے۔ مفتی صاحب قید میں گھبرا سے گئے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ترجیع بند لکھ ڈالا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

آپ کھنسے بیڈھب الہٰی دیکھئے کیسی بنے

مر رہے ہیں سب الٰہی دیکھئے کیسی بنے

پیروی مقدمہ میں جواب دعویٰ یہ کیا میں نے فتوے پر دستخط کئے۔ مگر کچھ عبارت بھی لکھدی ہے۔ بالجبر لوگ پڑھتے ہیں۔ وہ بالجبر میں نے لکھا ہے مفسدین نے زبردستی مجھ سے لکھوایا تھا۔ کاغذات برآمد ہوئے تو پڑھا گیا مفتی صاحب کے بیان کی تصدیق ہوئی۔ اس بنا پر چھوڑ دئے گئے۔

مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں حضرت آزردہ کے قید ہونے کی تفصیل لکھی ہے۔

"حضرت مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں آخر صاحبانِ کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ ڈگری موقوف جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے از راہِ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ امداد

(واگذاشت شدہ جائداد کا کرایہ) ان کے گزارہ کو کافی ہے۔
اس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی تیس چالیس روپے مہینے
کی آمدنی لیکن امام بخش کی اولاد اُن کی عترت ہے اور وہ دس بارہ
آدمی ہیں۔ فراغ بالی سے نہیں گذرتی ضعف پیری نے بہت گھیر لیا
ہے عشرہ ثامنہ کے اواخر میں ہیں یعنی اسّی برس کے قریب عمر ہے،
خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں۔

جامع مسجد دہلی جامع مسجد غدر میں انگریزی قبضہ میں آ گئی تھی۔ یہ مقدس عمارت
فوجی استعمال کے کام میں آتی۔ قریباً دو سال تک یہی صورت
قائم رہی۔ مسلمانانِ دہلی فریضہ نماز کی ادائیگی سے محروم تھے۔ جب دلی میں امن
جمی ہو گئی تو مفتی صاحب نے عمائد شہر کی ہمنوائی میں مسجد کی واگذاشت کی
سعی کی۔ آپ کے شرکا میں سے شاہی خاندان کے مرزا الٰہی بخش بھی تھے۔
چنانچہ گورنمنٹ نے یہ مسجد مسلمانوں کے حوالہ کی اور مسلمان اکابر شہر کی ایک
مختصر جماعت کی انتظامیہ کمیٹی بنا کر مسجد اس کو تفویض کی۔ اس منتظمہ جماعت
میں مفتی صاحب و مولوی اکرام اللہ خاں وغیرہ تھے۔

حلیہ گداز جسم۔ سانولا رنگ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی
ہوئی۔ بھری ہوئی ڈاڑھی تھی۔

لباس سادی وضع کے آدمی تھے۔ ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔
لباس سفید ایک برکا پیجامہ۔ سفید کرتہ۔ سفید ہی صافہ ہوتا تھا۔

تصانیف رسالہ منتہی المقال فی شرح حدیث لا تشد و الرجال۔ و در المنصور

فی حکم امراۃ المفقود - مجموعہ فتاویٰ تذکرۂ شعرائے ریختہ یادگار ہے۔ مگر نایاب ہے۔

شاگرد نواب صدیق حسن خاں - نواب یوسف علی خاں رام پوری - سرسید احمد خاں - مولوی ذوالفقار علی دیوبندی - مولوی فیض الحسن[1] - مولوی حکیم محمد الحسن امروہوی - مولوی احمد حسن مرادآبادی - مولانا سید نواب علی[2]

وفات اکیاسی برس کی عمر پاکر ۱۶ دسمبر ۱۸۶۷ء کو فالج گرا - کچھ عرصہ علیل رہ کر ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ کو راہی ملک بقا ہوئے۔ درگاہ حضرت چراغ دہلی میں دفن ہوئے۔

مولوی ظہور علی المخاطب بہ شمس الشعراء نے تاریخ وفات یہ لکھی ہے۔

چو مولانائے صدرالدیں کہ در عصر — امام اعظم آخر زماں بود
زہے صدر الصدور دنیائے محضر — بعدل و داد او چوں نوشیرواں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت — کہ ایں عالم نہ جائے جاوداں بود
ظہور افسوس آں استاد ذی قدر — پدر وارم ہمیشہ مہرباں بود
چراغش ہست تاریخ ولادت
کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود[3]

لہ داستان تاریخ اردو صفحہ ۳۰ ٹہ نقش سلیمانی - تذکرۃ الکرام صفحہ ۳۸۹
ٹہ تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۵۴

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ دہلوی

نواب شیفتہ باکمال لوگوں میں سے تھے۔ جو آج بھی علمی دنیا میں عزت کیساتھ یاد کئے جاتے ہیں۔ فارسی میں تو صاحب کمال تھے ہی اردو میں بھی استادانہ کلام چھوڑ گئے۔ اس جگہ نواب شیفتہ کا تذکرہ ذرا تفصیل سے پیش ہے۔

گو آپ کے سوانح کلیات حسرتی کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ مگر بعض واقعات پر ابھی پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس جگہ اُن پر روشنی ڈالنا مقصود ہے شیفتہ شاعر ہی نہ تھے بلکہ اپنے عہد کے محبانِ ملت و وطن سے بھی تھے۔

ولادت و خاندانی حالات عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ۱۸۰۶ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ جہانگیر آباد ضلع دہلی کے رئیس تھے اور والدہ مرزا اسمٰعیل بیگ ہمدانی مشہور سپہ سالار کی بیٹی اور احتشام الدولہ محمد بیگ ہمدانی کی نواسی تھیں۔

اجداد انگلستان سے عہدِ فرخ سیر میں وارد ہوئے۔ نواب مرتضیٰ خاں

اور نواب محمد خاں بنگش رئیس فرخ آباد کیجدی تھے۔ نواب مرتضیٰ خاں کا قیام بھی فرخ آباد میں تھا۔ یہی وہ وقت تھا کہ سلطنت دہلی کی بنا متزلزل ہو چکی تھی۔

مرتضیٰ خاں نے مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ مردم شناس راجہ نے انہیں سپاہ اندور کا افسر اعلیٰ مقرر کیا مگر اندور بھی اس وقت غیر مطمئن حالت میں تھا۔ نواب جب ملازم ہوتے ہی لارڈ لیک گورنر جنرل کی مدافعت کے لئے مامور کئے گئے جو حکومت کمپنی کی طرف سے مہاراجہ کے استیصال پر متعین ہوئے تھے۔ عرصہ تک مقابلہ رہا۔ بہت سے آدمی طرفین کے نذر جنگ ہوئے۔ آخر نواب مرتضیٰ خاں کی اصابت رائے اور موقع شناسی کی بدولت باہم صلح ہو گئی۔

لارڈ لیک کو اس موقع پر نواب مرتضیٰ خاں کے جوہر قابل ہونے کا پورا تجربہ ہو چکا تھا۔ مضافات دہلی میں پرگنہ پلول علاقہ گوڑگانو تین لاکھ روپیہ سالانہ محصول کا ان کو عنایت کیا۔ مگر نواب صاحب نے اس جاگیر پر قناعت نہ کرتے ہوئے جہانگیر آباد کا علاقہ اپنے خلف الرشید نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام خرید لیا۔ نواب مرتضیٰ خاں کے انتقال کے بعد علاقہ پلول گورنمنٹ نے واپس لے لیا۔ اور اراکین خاندان کی پنشن مقرر کر دی جو ہنگامہ ۵۷ء میں ضبط ہو گئی۔

تعلیم و استعداد

نواب شیفتہ نے ماں باپ کے زیر سایہ تعلیم و تربیت پائی۔ فارسی عربی اور علوم مروجہ کی تعلیم میاں جی مالا مال دہلوی سے

پائی۔ حدیث و قرأت میں مولانا حاجی نور محمد دہلوی نقشبندی۔ شیخ عبداللہ سراج حنفی مکی اور شیخ محمد عابد سندھی مقیم مدینہ منورہ سے استفادہ کیا۔ علاوہ انکے مولوی کرام اللہ محدث سے بھی بعض علوم پڑھے۔ فی الجملہ تمام علوم رسمی اور فنون متداولہ سے بخوبی واقف تھے۔

تصنیف و تالیف ترغیب السالک الی احسن المسالک اور تذکرہ گلشن بیخار" اور دیوان ریختہ و فارسی رقعاتِ شیفتہ ان کی علمی یادگاریں ہیں سفرِ حج کے حالات فارسی میں لکھے۔ جو ۱۲۵۰ھ میں "رہ آورد" کے نام سے طبع ہوئے۔

شاعری فارسی ادب میں شیفتہ کو پوری دستگاہ حاصل تھی۔ فارسی زبان میں اُن کی نظم و نثر کا درجہ کسی مشہور فارسی ادیب سے کم نہیں ہے۔ دہلی کی علمی صحبتوں اور شیفتہ کی فطری مناسبت طبع کا اقتضا تھا کہ سنِ شعور کے شروع ہونے کے ساتھ ہی ساتھ آپ فکرِ شعر کرنے لگے تھے ؎

اب شیفتہ اس فن کا ہوں میں پیرِ طریقت
گو عمر ابھی ہے مری اکیس برس کی

فارسی، اردو دونوں میں فکرِ سخن کرتے تذکرہ "ہمیشہ بہار" میں مولوی نصیر اللہ خاں خورجوی اور مولوی اکرام اللہ شہابی تصویر الشعرا حصہ دوم میں لکھتے ہیں۔

"نکتہ سنج زباں داں در نظم و نثر یکتائے زماں فصاحت و بلاغت از طرز کلامش پیدا است۔ وسعت خاطر و جودت طبع از ریختہ قلمش ہویدا عدیم المثال کریم الخصائل دانائے رموز

معانی بینائے غوامض نکتہ دانی۔ آں بزرگ فارسی خوش گفتہ گویا کہ درسفتہ چہ دریں جزو زماں شخصی از امراء ہندوستان چنیں بے نظیر برنخاستہ خدائے تعالیٰ گرامی اورا پایندہ دارد۔

سر سید احمد خاں مرحوم آثار الصنادید میں آپ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مسند آرائے جاہ و جلال زیب دہ مکنت و اقبال عمدہ اراکین دولت اسوۂ اساطین حشمت صاحب مرتبہ عالی مہبط انوار سعادت ازلی، مورد انظار مراحم لم یزلی نبض شناس شخص سخن فہمی و سخندانی قانون داں پردہ نکتہ سنجی و نکتہ رانی۔ حاتم کرم عطارد رقم رستم تواں نواب محمد مصطفیٰ خاں بہادر"

ریختہ میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔

فارسی ادب میں کامل دستگاہ رکھنے کے باوجود اردو ادب سے نہایت دلچسپی رکھتے تھے۔ مگر شعر عموماً کم کہتے تھے۔ اس کم سخنی کی وجہ سے لوگوں کو ان پر تکبر و غرور کا گماں ہوتا تھا۔ لیکن اُن کی بے تکلفی کے جلسے بھی ظرافت سے خالی نہ ہوتے تھے۔ سخن فہمی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اصلاحِ سخن میں بھی ملکہ خاص تھا۔ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کیا۔ مگر اُن کو بھی ٹوک دیا کرتے۔ مرزا غالب نے ایک قصیدہ لکھا جس کے مطلع کا پہلا مصرعہ یہ ہے ؎

عید اضحیٰ بسر آغاز زمستاں آمد

مرزا صاحب نے اول عید قرباں لکھا تھا نواب شیفتہ کے ٹوکنے سے عید اضحیٰ بنایا[1]۔ مولانا حالی ایک جگہ یادگار غالب میں لکھتے ہیں۔

[1] یادگار غالب صفحہ ۷۹

"اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو مرزا کے بعد اُن کے معاصرین میں سے کسی کی فارسی غزل اُن کی غزل سے لگا نہیں کھاتی تھی اور شعر کا جیسا صحیح مذاق اُن کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا ویسا بہت ہی کم دیکھنے میں آتا ہے۔ لوگ اُن کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے اُن کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اس کی نظر سے گر جاتا تھا اور انکی تحسین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی۔ مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

نواب ممدوح کی شان میں مرزا صاحب کا ایک قصیدہ بھی ہے۔ اس کا ایک شعر ہے۔

آں ہمائے تیز پروازم کہ بال
در ہوائے مصطفیٰ خاں می زنم

ایک جگہ اور مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

غالب ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل
چوں او تلاشِ معنیٔ مضموں نکردہ کس

ایک رقعہ میں نواب صاحب کی غزل کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

زہے غزل و خوشا غزل پایۂ ایں زمیں را بہ آسماں بردہ اند سخن را بنوازش زمینان از آسماں فرود آوردہ۔

سخن سرودن حق شناسیست اگر آبروئے ستودن داشتہ باشم

لہ یادگارِ غالب صفحہ نمبر ۹

برخود نازمی تو انم کرد زیادہ زیادہ۔"

حکیم مومن خاں مومن اپنے قابل شاگرد کی استادی پر فخر اور اُنکی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے شیفتہ کے "گلشن بیخار" کی تقریظ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

آں شیفتہ کز خرد گرامی باشد | سرخیل سخنوراں نامی باشد
اکنوں حبذا بماند الا بعدم | محمود سنائی و نظامی باشد

مومن ایک شعر میں شیفتہ کی سخن فہمی کی داد اس طرح دیتے ہیں ؎

ز تحسین او حُسنِ معنی نیاز
ہزار آفریں بر چنیں امتیاز

کلام نواب شیفتہ کے کلام میں گرمی اور لذت کے علاوہ شکوہ الفاظ اور چستی ترکیب نمایاں نظر آتی ہے۔ تلاش الفاظ اور ترکیب کی روش میں غالب اور مومن کا رنگ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے کلام میں میر تقی میر کی پیروی اور سادہ بیانی پر فخر کرتے ہیں ؎

شیفتہ سادہ بیانی نے بہت چمکایا
ورنہ صنعت میں بہت لوگ ہیں بہتر ہم سے

تذکرۂ شعراء تذکرہ "گلشن بیخار" ۱۲۵۰ھ میں لکھا گیا۔ اس زمانہ کی رسم کے مطابق شعرا کے کلام کے ساتھ ساتھ اُن کا مختصر حال لکھنے کے لئے فارسی زبان اختیار کی گئی۔ لیکن اپنی اس خصوصیت کے لحاظ سے کہ شعرا کے کلام پر آزادانہ نکتہ چینی کی گئی ہے۔ اردو شعرا کا یہ سب سے پہلا تذکرہ ہے جس میں تنقید کی

ؔ نواب شیفتہ مرحوم "زمانہ" دسمبر ۱۹۳۱ء از حضرت نظامی بدایونی

طرف قدم بڑھایا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے جو تذکرے اردو شعراء کے لکھے ہیں انہیں تعریف کے سوا تنقیدی پہلو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

مگر اس وقت کے طبائع عادی اس امر کے تھے کہ تعریف و توصیف کے سوا شعر کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنا اخلاقی جرم سمجھا جاتا تھا۔ صاحب "ہمیشہ بہار" اس تذکرہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"تذکرہ گلشن بیخار بعبارت شستہ و رفتہ والا از یادگار است۔ اما خالی از خار نیست چہ گلشن را خار لازم و آں لزوم تعصب است، الحق کہ بجز ذات حق از عیب خالی نیست"

ان سے زیادہ حکیم غلام قطب الدین خاں باطن اکبر آبادی نے زہر اگلا ہے۔ نغمہ عندلیب "گلشن بیخار" کے مقابلہ میں لکھا ہے۔

نواب شیفتہ نے نظیر اور ان کے شاگردوں کی کچھ زیادہ قدر نہ کی۔ یہ بگڑ بیٹھے شیفتہ، آزردہ، مومن، غالب کی دل کھول کر مذمت کی۔ عبارت نغمہ عندلیب "گلشن بے خزاں" کی آرزو ہے..... نو رتن مہجور کی وضع پر ہے۔ وہی التزام ضلع جگت گہیں جولاہوں کا ضلع کہیں صرف کا کہیں نحو کا کہیں فتوی فرائض کا رعایت لفظی سے بھرا ہوا ہے، حکیم مومن خاں کا ذکر جولاہوں کے لوازمات یا فندگی کے ضلع میں ہی جو نہایت مضحکات ہے۔

غرض ایک طرف تذکرہ کی یہ قدر دانی تھی۔ دوسری طرف اس کی بیحد قدر ہوئی۔ اور تذکرہ نویسوں نے نواب شیفتہ کو سراہا۔ بلکہ جتنی تعریف کی ہے وہ میرے خیال سے کم ہے۔

نواب صدیق حسن خاں قنوجی اپنے تذکرہ شمع انجمن میں لکھتے ہیں۔

"اکثر عمر در مشق فن سخن بسر بردہ و در مراتب نظم و نثر ادائے خاص داشت

با پارسی و ریختہ طبع او چناں مناسب افتادہ کہ بہر شیوہ سخن خوش و حرف

دلکشے میگزارد اگر مجموع منظوم و منثور او را بینی ایں سخن را مسلم داری"

نواب نورالحسن خاں کلیم "طور کلیم" میں لکھتے ہیں ۔

"حضرت شیفتہ از اوان صبا بہ مشق سخن مصروف بود و عمرے دریں شغل

بسر بردہ و در مراتب نظم و نثر ادائے خاص دارد و بہرہ دو زبان ریختہ و پارسی

عمرے کرمی اسواد از من پیرس کہ مدتے بہ روش او حرف گزار دام فیضے

کہ صورت او معنوی یافتہ ام" از تلامذہ حکیم مومن خاں کسے بجا او برنخواستہ"

شیفتہ کی سیاسی زندگی

تذکرہ نویسوں نے شاعرانہ حیثیت سے زیادہ شیفتہ کو دیکھا اور ان کے دسترس سے بھی یہ سوانح باہر تھے۔ آپ کے کلیات میں سوانح لکھے گئے اس میں بھی نواب شیفتہ کی سیاسی زندگی پر تبصرہ نہیں کیا گیا۔ نواب اپنے عہد کے ملک و ملت کے بہی خواہ تھے۔ اور ان شخصیتوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی کرنے میں کسر نہ رکھی۔ مگر قوم کی قسمت بگڑ چکی تھی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ عمال کمپنی بہادر نے جو روش اختیار کی تھی ملک گیری کے اعتبار سے اپنی جگہ صحیح مگر آزادی کے اعتبار سے بے چینی کا سبب بنی۔ جاگیروں کی ضبطی نے ارباب ثروت و جاگیر میں ایک مخالفت کی لہر پیدا کر دی تھی۔ ادھر ہنگامہ جو برپا ہوا تمام جاگیر دار بادشاہ دلی کے ہمنوا بن گئے۔ نواب شیفتہ کے ہم رشتہ رئیسوں نے نواب کو اپنا لگوا لیا۔ رؤسا میں سب سے بڑی شخصیت ولی داد خاں

رئیس مالاگڈھ کی تھی اُن کے پرچم کے تلے غلام حیدر خاں زمیندار پونڈری سہارنپوری۔ قاضی وزیر علی بلند شہری۔ عبد اللطیف خاں رئیس خان پور۔ اسمٰعیل خاں عظم خاں۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد وغیرہ جمع تھے۔ ولی داد خاں مذکور کی بھانجی بادشاہ دہلی کے ایک شہزادہ سے بھی منسوب تھی۔ شیفتہ کے متعلق بادشاہ سے خط و کتابت کرنا تفویض تھی۔ چنانچہ ہنگامہ ہونے پر ولی داد خاں نے اپنے علاقہ میں بڑی سرگرمی دکھائی مگر پانسہ اُلٹا پڑا۔ بعد تسلط ہر ایک باغی قرار دیا گیا کسی کو حبس دوام ہوا۔ کوئی ۷ برس کے لئے قید ہوا شیفتہ کو بھی ۷ برس کی قید فرنگ ہوئی۔ نواب صدیق حسن خاں بہادر شوہر نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والئی بھوپال نے بڑی کوششوں کے بعد اُن کو رہا کرایا۔ اس مصیبت سے نجات پانے کے بعد نواب مصطفےٰ خاں نے جو خط نواب صدیق حسن خاں کے نام لکھا ہے یہاں بہ لفظ نقل کیا جاتا ہے۔

خط سامی کہ در زمان مبتلا بودن مخلص بہ بند بلا بنام صدر الصدور صاحب بہادر رسیدہ بود بر طبق آں صاحب ممدوح آں چناں سامی جمیلہ و کوشش ہائے جمیلہ و کوشش ہائے نبیلہ فرمودند کہ صورت نجات مخلص بظہور رسید۔ آرے مقتضائے محبت ہائے سامی ہمیں بود۔ ایں احسان فراموش شدنی نیست۔ اکنوں نجات صوری رو داد۔ لیکن نجات معنوی باقی ست۔ یعنی جائداد وغیرہ وجوہ معاش ہنوز معلق وا گذاشت نہ شدہ۔ ایں مقدمہ ہم با جلاس صدر الصدور صاحب موصوف رسید۔ پس ضرورت افتاد کہ بہ آنجناب اطلاع کنم۔ ما بنام شاں خط

سفارش چنانکہ سابق نوشتہ اند ترقیم فرمایند و تحریر ایں معنی کہ بظہور
ایں امر شکر گزار سامی خواہم شد فضول است کہ میاں ما و شما گنجائش
ہمچو امور نیست کہ یاد از بیگانگیہا مید ہد ۔ ظاہر است کہ باز ایں منت
بس عظیم خواہد بود۔

مورخہ یکم شعبان ۱۲۷۳ھ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے میر مومن علیخاں
صدر الصدور ساکن سندیلہ کو ایک سفارش نامہ لکھا اور بڑی جد و جہد کے بعد
نصف جاگیر واگذاشت ہوئی :

اخلاق و عادات

نواب صاحب پابند وضع خوش اخلاق اور مذہب کے دلدادہ نہایت صابر و مستقل مزاج بزرگ تھے ۔ تسلیم و رضا کی دولت خصوصیت سے عطا ہوئی تھی ۔ ہر حال میں خوش رہنا اُن کی زندگی کا نمایاں ترین وصف تھا ۔ طبیعت میں استغنا بہت تھا ۔ مہمان نوازی اور فیاضی میں مشہور تھے ۔ مجددی نقشبندی خاندان سے بیعت تھی شریعت کے بڑے پابند تھے ۔ بقول کہ کبھی کسی ناجائز یا غیر مشروع امر کا ارتکاب نہ کرتے تھے ۔

ڈر ہے کہ ہو نہ شوق مزامیر شیفتہ
ورنہ کبھی سماع مجسمر استماع کروں

مرض الموت اور وفات

۶۴ سال کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں بمقام دہلی وفات پائی حضرت شاہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ میں دفن ہوئے ۔

منشی محمد اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی

"علمائے کرام کے علاوہ ہندوستان کے شعراء کا بھی سیاست ملکی میں بڑا حصہ ہے مگر تذکرہ نویس اپنی عدم واقفیت کی بنا پر نظر انداز کرتے رہے سعادت یار خاں رنگین جس نے وزیر علی خاں نواب اودھ کا ساتھ دیا اور نواب مرشد آباد کو وزیر علی خاں کی ہمنوائی کے لئے آمادہ کرنا چاہا۔ اس وقت کی سیاست حضرت رنگینؔ کی کارفرمائی قابلِ توقیر ہے۔ بندیلکھنڈ میں منشی محمد اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی کا ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں کافی دخل ہے۔

حضرت منیرؔ کو ایک خوشگو شاعر سے زیادہ ملک میں کسی نے روشناس نہیں کرایا۔ چنانچہ اس جگہ اُن کے سیاسی کارنامے مختصراً پیش کرنا ہیں کہ علماء ہی نے نہیں بلکہ شعراء بھی ملک کی سیاست میں برابر کے شریک رہے۔ آپ کے حالات کے لئے مسلم یونیورسٹی مٹن لائبریری سے بڑی

مددملی۔ ایک تاریخی قطعہ کے لئے مجکو مولوی سید الطاف علی صاحب بریلوی کی ہمراہی میں حبیب گنج کا سفر کرنا پڑا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ میں "کلیاتِ منیر" سے مطلوبہ قطعہ حاصل کیا۔ صعوبت سفر ظاہر۔ نواب صاحب کا کتب خانہ تشنگانِ علم کے لیئے سیرابی کا ملجا و ماویٰ ہے۔

وطن منشی سید محمد اسمٰعیل حسین متخلص بہ منیر کا وطن شکوہ آباد تھا۔ ہندوستان کے نامور شاعر تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ حضرت سید بہاء الدین بزمانِ سلطان علاء الدین غوری ہندوستان آئے۔ اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کے پوتے کے پڑپوتے سید شرف الدین علی خاں کو عہد محمد شاہ میں شکوہ آباد اور فیروزآباد کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ ۱۷۶۱ء میں جنگ پانی پت کے بعد نواب دوندے خاں اس علاقہ پر قابض تھے[1]۔ منشی منیر کے والد ماجد کا نام سیّد احمد حسین متخلص بہ شاد تھا۔ مرزا رفیع سودا دہلوی سے ان کو تلمذ تھا۔ مسٹر اسٹاکول حاکم آگرہ نے ان کو اپنے یہاں سررشتہ دار کر دیا تھا۔ عمر طبعی پاکر ۱۲۵۰ھ میں انتقال کیا۔

پیدائش و تعلیم منیر ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے فارسی اور عربی کی تعلیم باپ سے پائی۔ دینیات کی تحصیل اپنے بھائی مولوی سیّد اولاد حسین سے کی۔

شاعری منشی منیر کو لڑکپن سے شعر و شاعری سے شوق تھا۔ آنکھ کھولی گھر میں شعر و سخن کے چرچے پائے۔ آگرہ میں ننھیال تھی اکثر آتے جاتے رہتے۔ اُن دنوں وہاں شعر و شاعری کی بڑی گرم بازاری تھی۔ خلیفہ گلزار علی اسیر

[1] حیاتِ حافظ رحمت خاںؒ از مولوی سید الطاف علی بریلوی

کا ڈنکا بج رہا تھا۔ حضرت مہر اور ہاتمن کی شاعری عروج پر تھی۔ آئے دن مشاعرے ہوتے۔ لوگ غزل گوئی اور غزل سرائی کو نظر وقیع سے دیکھتے۔ منشی منیر نے بھی غزل گوئی سے لگاؤ پیدا کیا۔ حسن اتفاق نواب نظام الدولہ خلف الصدق وزیر شاہ اودھ بطور سیر و تفریح آگرہ آئے ہوئے تھے۔ اُن کی دلچسپی اور خوش وقتی کے لئے مہاراجہ بلونت سنگھ کاشی نے محفل مشاعرہ منعقد کی۔ خود بھی شاعر راجہ تخلص کرتے تھے۔ اسیر و مہر سے مشورہ سخن کیا تھا۔

اس مشاعرہ کی دھوم تھی۔ نامی شعراء شرکت کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔ منیر کو بھی خیال گزرا کہ غزل کہہ کر مشاعرہ میں پڑھی جائے۔ چنانچہ محفل میں پہونچے راجہ کاشی کے چھتہ میں یہ مشاعرہ تھا۔ راجہ صاحب نے اہتمام خاص کیا تھا۔

استادوں سے پہلے نوآموزوں نے غزلیں پڑھیں۔ ان میں ہی منیر کو جگہ دی گئی۔ کہتے ہیں ؎

دنیا سے ہے باہر دلِ دیوانہ کسی کا
بستی میں سماتا نہیں ویرانہ کسی کا

ساقی نگہ مست تری لڑتی ہے کسی کا
کیوں چھوڑ نہ ہو نشہ میں پیمانہ کسی کا

کعبہ سے چلے آتے ہیں بتخانہ کو بادل
پہونچا ہے کہاں نعرۂ مستانہ کسی کا

نیند آئی ہے ہر ایک کو آغوش لحد میں
شاید کہ اجل کہتی ہے افسانہ کسی کا

عاشق ہوں منیر اپنے ہی اندازِ سخن کا!
وابستہ کسی کا ہوں نہ دیوانہ کسی کا

نکتہ سنجوں اور اہلِ کمال نے منیر کی امید سے زیادہ داد دی۔ اور استادوں نے اپنے پہلو میں جگہ دی۔ نواب نظام الدولہ منشی منیر کی نازک خیالی شستگی زبان

اور حسنِ بیان پر فریفتہ ہو گئے اور کہنے لگے "میاں صاحبزادہ کس کے شاگرد ہو؟"
منیر نے عرض کیا "ابھی کوئی استاد ملا نہیں ہے۔ کامل کی تلاش ہے!" نواب نے
کہا "اگر تم ہمارے پاس رہو تو ہم تم کو بہت عزت سے رکھیں گے اور شیخ ناسخ کا
شاگرد بھی کرا دیں گے۔" منشی منیر نے بطیب خاطر نواب صاحب کے ساتھ رہنا
منظور کر لیا۔

اس تقریب سے آگرہ سے منیر لکھنؤ پہونچے۔ نواب نے حضرت ناسخ سے
ان کی سفارش کی وہ ان پر توجہ کرنے لگے۔ غزل پر اصلاح دیتے۔ زمانہ
کے انقلاب نے شیخ امام بخش ناسخ سے لکھنؤ چھڑایا تو منیر نے ناسخ کے اشارے
سے میر علی اوسط رشک کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ انھیں کے ساتھ کانپور
مرشد آباد۔ کلکتہ وغیرہ مشاعروں میں گئے ؎

کلکتہ کو میں ڈلک میں جاتا ہوں اے منیر
فکرِ غزل ہے راہ میں کیا خوب بات ہے

لکھنؤ میں مستقل قیام رہا اپنے دیوان کے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں۔
"آخر بحوادث گوناگوں مبتلا گردید۔ بہ بیت و سلطنت لکھنؤ شناختم بقول
فخر المتغزلین مرزا غالب دہلوی ؎

اندر آں بقعۂ معمور ز وں تنگیٔ خویش
حسرت آگیں چو گنہگار بزندانِ قسم

معاش کی طرف سے فکرمند تھے۔ نواب اصغر علی خاں نبیرۂ نواب معین الدولہ
ولد سید باقر علی خاں ظفر جنگ خلف ثالث نواب معتمد الدولہ بہادر نے اپنی

مصاحبت میں رکھ لیا۔ بے فکری سے گزرنے لگی اور نواب واجد علی شاہی دور کی عام رنگ رلیاں تھیں۔ چند دن فارغ البالی سے گزرے تھے۔ بدقسمتی نے پھر چکر ڈالا۔ احمد حسن خاں عروج نے مدد کی۔ اس زمانہ میں سیّد محمد ذکی خاں بہادر عرف نواب بہادر متخلص بہ ذکی نے منیرؔ سے اپنے کلام کی اصلاح لی۔ دو سال اس طرح گزر گئے۔ مگر منیرؔ کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی۔ نواب تجمل حسین خاں بہادر ظفر جنگ والی فرخ آباد نے زادِ راہ بھیج کر طلب کر لیا۔

قطعہ

امیرِ عہد تجمل حسین خاں نواب
خطاب جن کا ظفر جنگ نام ہے اعلیٰ!
زمانہ میں اُنھیں کہتے ہیں لوگ حشمت جنگ
بہ سپہرِ کرم فیضِ عام میں یکتا!
انھوں نے شقہ مع صرفِ راہ بھیجا ہے
طلب کیا ہے کمال اشتیاق سے بخدا
چلا ہوں لکھنؤ سے سوئے فرخ آباد آج
ہزاروں حسرتیں رنج و ملال میں ہے صدا
فراقِ لکھنؤ سے ہے منیرؔ یہ تاریخ
بہشتِ ہند سے افسوس ہائے میں نکلا

فرخ آباد میں نواب نے اور اہل فرخ آباد نے آپ کے کمال کی نہایت قدردانی کی۔ اس زمانہ میں ایک قصیدہ لکھ کر نواب کے حضور میں گزرانا جس کا مطلع یہ ہے

قلزم فیض کے کس کے ہوئے پیدا گوہر
اپنے کوزوں میں لئے پھرتے ہیں دریا گوہر
آبرو آپ کی خدمت میں بڑھی ہے ایسی
بن گیا اختر تقدیر ہمارا گوہر

نواب تجمل حسین خاں نے اس قصیدہ کے صلہ میں ایک خلعت زریں اور زنجیر طلائی عطا فرمائی۔ اور معقول مشاہرہ مقرر کر دیا۔ شہر میں شہرت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ موزوں طبع بخوشی خاطر آپ سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔

نواب واجد علی خاں رضوان ابن نواب نجابت علی خاں نبیرۂ نواب مظفر جنگ بہادر۔ نیز منشی مادھو رام متخلص بہ جوہر فرخ آبادی آپ کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ ان دنوں ایک مشاعرہ ہوا۔ طرح یہ تھی۔ ع

اُس کا شیدائی ہوں جس کا کوئی شیدائی نہیں

حضرت منیر نے بھی طرح پر غزل کہی اور مشاعرہ میں پڑھی بمطلع اس کا یہ تھا

اور مجھ سا جان دینے کا تمنائی نہیں!
اس کا شیدائی ہوں جس کا کوئی شیدائی نہیں

مقطع میں کہتے ہیں

لکھنؤ کی آرزو میں جان دیتا ہے منیر
سلطنت کا کبھی زمانے میں تمنائی نہیں

کچھ عرصہ بعد نواب تجمل حسین خاں کی رفاقت ترک کر کے لکھنؤ آ گئے۔ اپنے استاد رشک کی صحبت میں رہنے لگے۔ بعد ازاں اپنے استاد کے ساتھ کانپور جانا ہوا۔ وہاں مشاعرہ تھا۔ اس میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ نواب زادہ علی بہادر خاں باندہ بھی محفل مشاعرہ کی زینت تھے۔ انھوں نے طرح کی غزل کے بعد غزل پڑھی ؂

کیا جانئے کیا لطف ہے چلمن کے اُدھر آج
جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر آج
محفل میں ہے ہر سمت حسینوں کا گزر آج
اے بے خبری تو ہی بتا ہم ہیں کدھر آج
ڈرتا ہوں کہ بُو خونِ تمنا کی نہ چھوٹے
ہر سانس پہ آتا ہے مرے منہ کو جگر آج!
غصّہ میں نزاکت نے کیا ہے عجب احساں
وہ پھیرتے ہیں پھر نہیں سکتی ہے نظر آج
ہم سا کوئی نادان منیرؔ اور نہ ہو گا
کل زاد کی تدبیر ہے دُنیا سے سفر آج

تمام اہلِ مجلس نے بڑی داد دی۔ نواب زادہ باندہ نے آپ کے اشعار سے بڑا اثر لیا۔ منشی منیرؔ سے کہا حضرت میرے ساتھ باندہ چلئے اور میری فکرِ سخن میں امداد دیجئے۔ چنانچہ دو سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گئے۔ نواب کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔ بہادر علی خاں نے نوابؔ ہی تخلص رکھا۔ کہتے ہیں ؂

قصد کرتا ہوں ترے گھر سے جو میں جانے کا
دل یہ کہتا ہے کہ تو چل میں نہیں آنے کا

نواب بہادر علی خاں کے والد ذوالفقار علی خاں کا سنہ ۱۲۴۹ھ میں انتقال ہوا۔

شد آہ ذوالفقار علی در نیام آہ
۱۲۴۹ھ

یہ سنہ ۱۲۶۵ھ میں جانشین ہوئے۔ منیر نے ایک قطعہ لکھ کر پیش کیا۔

قطعہ

علی بہادرِ عالم پناہ و بندہ نواز	نہاد چوں بسرِ خویش افسرِ شوکت
منیر مصرعِ تاریخ ایں عمل گفتہ	جلوس باد مبارک بہ مسندِ نصرت ۱۲۶۵ھ

مسند نشینی علی بہادر

بہ نواب جاں بخش گیتی ستاں	عطا کرد مسند چو ربِ کریم
ازیں جشنِ پُر نور شد باغِ دہر	رگِ برق گردید موجِ نسیم
بہ فیضِ خداوندِ گیتی پناہ	چناں گشت خرم چو باغِ نعیم
شدہ دستہا مامنِ آبِ زر	کفِ ہر گدا گشت چوں لوحِ سیم
بہ تاریخ گفتم بہ یک بیت من	کشیدم دریں رشتہ دُرِ یتیم

خوشا شوکتِ مسند بزمِ خود
چراغِ امید و مرادِ عظیم

دیگر

خلعت آیا گورنری سے ملا
کھل گیا باغِ ثروت و جلال
میرے نواب ہوگئے مسرور
ہو مبارک یہ سال فرخ فال
کہی برجستہ میں نے یہ تاریخ
آج آیا ہے خلعتِ اقبال
۱۲۶۵ھ

واقعہ | نواب علی بہادر ایک دن اپنے باغ میں حسبِ معمول ٹہلنے جانے لگے۔ منشی منیر کو بھی ہمراہ لیتے گئے۔ دورانِ چہل قدمی میں بائیں روش سے ایک چمیلی کا پھول توڑ کر ان کو دیا۔ اس پر فی البدیہہ تاریخ کہہ ڈالی اور نواب کے سامنے پیش کی ؎

صبح آئے حضور میرے پاس!
نورِ حق کا ہوا فلک سے نزول
لے گئے اپنے ساتھ بگھی پر
ہو گیا مطلبِ عظیم حصول
پھر ہوا کھانے میں ہوئے مصروف
جس طرح تھا ہمیشہ کا معمول
پھر دکھائی گلاب باغ کی سیر
گل جنت سے بھی سوا ہر پھول
گلِ تازہ دیا منیر مجھے
ہوگئی باغ باغ جانِ ملول
میں نے برجستہ یہ کہی تاریخ!
گلِ خورشید ہے اچھا ہی پھول
۱۲۶۶ھ

نواب صاحب اس قطعہ کو سنکر بہت محظوظ ہوئے۔ اور جناب منیر کی عزت و توقیر میں اور زیادہ اضافہ کیا۔ پھر تو باندہ میں اچھی طرح گزرنے لگی۔ کہتے ہیں ؎

نواب کے کرم سے زمانہ ہے کامیاب
باندہ میں روز دیکھئے چرچا ہے عید کا

نواب صاحب سے ایک دن استاد کی خوبی کا ذکر کرنے لگے نواب نے بھی اُن کی تعریف کی۔ کہتے ہیں ؎

یکتائے عصر، عالم و فاضل جنابِ رشکؔ
علامہ و محققِ کامل جنابِ رشکؔ
کیوں کر نہ میری قدر زیادہ ہوا ے منیرؔ
سمجھا گئے تمام مسائل جنابِ رشکؔ

سیاست منیر کو بادشاہ لکھنؤ سے بڑی عقیدت تھی۔ نواب واجد علی شاہ کی معزولی کا اثر انھوں نے بھی لیا۔ کمپنی بہادر سے عدم موالات کرنے لگے۔ اور نواب صاحب کے بھی کان بھرے۔ بندیل کھنڈ کے علاقہ میں جھانسی کو اہمیت تھی۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت تھا۔ یہاں کا فرمانروا راجہ گنگا دھر راؤ آف جھانسی تھا۔ اس کو مارو پنت تانبے کی لڑکی لکشمی بائی بیاہی تھی۔ مارو پنت آخری پیشوا باجی راؤ دوم کا برہمن پروہت تھا۔ لکشمی بائی کے آٹھ برس بعد ایک بچہ ہوا۔ جو چار ماہ کی عمر میں فوت ہوگیا۔ راجہ گنگا دھر کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور بچہ کے غم میں گھلتا رہا۔ اپنی موت سے کچھ پہلے دامودر راؤ جو قریبی عزیز تھا اس کو متبنّیٰ کر لیا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی ہندوستان کا گورنر جنرل تھا۔ اس کی منشا تھی کہ تمام ریاستیں حکومت سے ملحق ہو جائیں ستارا۔ ناگپور کے بعد جھانسی پر نگاہ تھی۔ گنگا دھر راؤ نے مرنے سے پہلے

انگریز ریزیڈنٹ سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی تاج برطانیہ سے عمر بھر کی وفاداری کے پیش نظر جھانسی کا الحاق نہ کریں۔ مگر درخواست نامنظور ہوئی۔ جھانسی کا الحاق ۱۸۵۳ء میں عمل میں آیا اور نوجوان بیوہ لکشمی بائی بے دخل کر دی گئی۔ اس نے کمپنی کے اس خلاف عہد طرز پر آواز بلند کی مگر احتجاج صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اس پر رانی کو ارباب حکومت سے عناد سا پیدا ہو گیا۔ رانی نے اپنے طریقۂ عمل سے اپنی رعایا کو گرویدہ کر رکھا تھا۔ ہر ایک اس کو اپنی ماں سمجھتا تھا۔ اس اثنا میں طوفان کے بادل چھا رہے تھے۔ کمپنی کے عمال کی سخت گیری سے عوام میں بے چینی کی چنگاریاں اٹھی ہو کر غدر کے واقعات کی صورت اختیار کر گئیں جو کہ دراصل ہندوستان کی طرف سے اپنی سو سالہ غلامی کا جوا اتار پھینکنے کے لیے پہلی بغاوت تھی۔ بغاوت کا یہ شعلہ جوں ہی بھڑک اٹھا اس نے تقریباً سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

بلوائے عام دلی لکھنؤ اس تحریک کے مرکز بن گئے۔ دور و نزدیک کے اور مقامات میں بھی ہنگامے رہے۔ لکشمی بائی بھی ہنگامیوں کی ہم نوا ہو گئی۔ سر ہیگ روز نے ایک مضبوط فوج کے ساتھ جھانسی پر چڑھائی کر دی۔ اس کے پاس گیارہ ہزار جوانوں پر مشتمل فوج تھی۔ مقامی کارخانوں کی تیار کردہ توپوں۔ بندوقوں۔ گولوں اور بارود وغیرہ سے آراستہ کر دیا گیا اور وہ مقابلہ کے لئے آمادہ ہو گئی۔

رانی نے تانتیا ٹوپی کو بھی امداد کے لئے لکھا۔ تانتیا فوج لے کر آیا مگر انگریزوں سے شکست کھا گیا۔ نتیجہ میں رانی کو شہر کی حفاظت ترک کرنا پڑی اور

پیدل کالپی روانہ ہو گئی۔ راؤ صاحب یہاں کے محاذ کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ اس نے ڈھائی سو سواروں کا دستہ رانی کے زیرِ کمان دیا۔ اس نے انگریزی فوج سے مقابلہ کیا اور دادِ شجاعت دی۔ مگر راؤ صاحب اپنے مقابل سے شکست کھا گیا۔ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ رانی نے راؤ صاحب کی ہمت بندھائی اور مشورہ دیا کہ موقعہ ہے گوالیار کے قلعہ پر قبضہ کر کے پھر دشمن سے نبٹا جائے۔ راؤ صاحب کو یہ تجویز پسند آئی۔ تمام فوج کو سمیٹ کر راجہ سندھیا کو آگھیرا۔ وہ تابِ مقابلہ نہ لا سکا۔ اور مغلوب ہوا۔ اب گوالیار رانی کے قبضہ میں تھا۔ مگر راؤ صاحب بالکل ناکارہ مغرور اور عیاش مزاج آدمی تھا۔ گوالیار کی فتح کی خوشی میں اپنے آپ کو بھول گیا۔ اُسے چاہیئے تھا کہ مزید جنگی تیاریوں پر توجہ دیتا اور فوجوں کے اندر ضبط و نظم مستحکم کیا جاتا مگر وہ غافل رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر ہیگ روز نے بھاری فوج کے ساتھ گوالیار پر حملہ کر دیا۔ بشیورام تانتیا ٹوپی اور لکشمی بائی دو دیویوں اور چندہ مصاحبوں کے ہمراہ میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ مخالف فوج اس کے پیچھے لگ گئی۔ ایک ایک کر کے اُنھوں نے بھون کھایا۔ رانی نے مقابلہ کیا۔ یہ بھی مجروح ہو کر گھوڑے سے گری۔ ایک خدمتگار قریبی جھونپڑی تک لے گیا۔ لیکن کشتیِ عمرِ رواں کنارے لگ رہی تھی۔ چند لمحوں کے اندر مرغِ رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ یہ دن ۱۸۔ جون ۱۸۵۸ء کا تھا۔

باندہ باندہ سے قریب یہ واقعات رونما ہو رہے تھے۔ نوّاب علی بہادر خاں ایک شجاع اور جری شخص تھا۔ اُدھر رانی جھانسی اور تانتیا ٹوپی کے نامہ و پیام شرکتِ جنگِ آزادی کے جاری تھے۔ مرزا ولایت حسین خاں وزیرِ اعظم باندہ اور نشی

سید اسمٰعیل حسین منیرؔ سے مشورہ کیا۔ ہر ایک جاں بازی اور سرفروشی کے لئے مستعد تیار تھا۔ مقامی فوج کو کیل کانٹے سے درست کرکے اولاً راج گڑھ کے قلعہ پر نواب نے حملہ بول دیا۔ قلعہ فتح کر لیا۔ اور دوآہ بندیلہ کو گرفتار کر لیا۔ اس فتح کی خوشی میں جناب منیرؔ نے یہ تاریخ کہی ؎

چو فوج بندیلہ بہ باندا رسید
زحصنِ اجے گڈھ برائے فساد

برایشاں ظفر یافت نواب ما
دلِ اہلِ انصاف گردید شاد

چنیں گفت تاریخ نصرت منیرؔ
خدا فتح عالی بہ نواب داد

قطعہ در تہنیتِ فتحِ نواب علی بہادر جنگ بہ دوآہ بندیلہ

فتح دی اپنی عنایت سے خدا نے آپ کو
سب عدو مقتول تیغ و بستۂ زنجیر ہیں
آیۂ اِنّا فتحنا مژدۂ فتحِ قریب
تہنیت سے ہم زباں در دولتِ تقریر ہیں
فتح زیبا و مبارک ہو مٹا خارِ خلش
آپ منظورِ نگاہِ مالکِ تقدیر ہیں

ایک قطعہ کا شعر یہ ہے ؎

ہوا محبوس دوآ باندہ میں آکر اجے گڈھ سے
پھنسا دام مصیبت میں سپاہ ناگرچہ کوا ہے

۱۵ - جون ۱۸۵۷ء کو مسٹر ایچ اے کاک دِل قلعۂ باندہ میں آیا - اس کو مصاحبوں نے قتل کر دیا - اس کے بعد ۱۸ - اکتوبر کو ارد گرد سے حریت نواز جمع ہو گئے - ان کے پاس دو ہزار گھوڑے سوار تھے جنرل وائٹ لاک نے حملہ کیا - مگر اس کو شکست اٹھانا پڑی۔[1] اس جنگ کا پلہ بھاری تھا - ایک جنگی کونسل بنائی گئی جس کے ارکان میں محمد سردار خاں ناظم - میر انشاء اللہ سپہ سالار افواج اور وزیر اعظم مرزا ولایت حسین تھے - امداد حسین اور فرحت علی افسرانِ فوج قرار دیے گئے - جنرل وائٹ لاک نے اپریل ۱۸۵۸ء کو دوسرا حملہ باندہ پر کیا - مگر مقابلہ پر اہلِ باندہ ٹھہر نہ سکے شکست یاب ہوئے - ۲۰ - اپریل ۱۸۵۸ء کو سرکاری قبضہ باندہ پر ہو گیا -

نواب نے راہِ فرار اختیار کی - مرزا ولایت حسین اور منشی منیر نواب فرخ آباد سے امداد لینے روانہ ہوئے - فرخ آباد میں ہر دو گرفتار ہو گئے - مقدمہ ان پر چلتا رہا - مرزا ولایت حسین کو سزا حبس دوام بہ عبور دریائے شور ہوئی - انڈمان بھیجے گئے - منشی منیر پر ایک بلا اور نازل ہوئی - مصطفٰے بیگ ان کے دوستوں میں سے تھے - انھوں نے نواب جان طوائف کو قتل کیا - اور منشی منیر کو پھنسوا کر خود بچ گئے - منیر اس قصہ کو لکھتے ہیں -

مصطفٰے بیگ ایک صاحب انھیں ہیں — کج روؤں میں بڑھ کے چرخِ پیر سے
کر کے خونِ ناحقِ نواب جان — مجھ کو بھی پھنسوا دیا تزویر سے
خون میرا وہ سمجھتے تھے حلال — تھا جو میں ذریتِ شبیر سے

آخرش ان کو بھی سزا آٹھ دس سال کی ملی - اور انڈمان بھیج دیے گئے - فرماتے

---

[1] گزیٹر جالون صفحہ ۱۸۱ [2] اردوئے معلّی اپریل ۱۹۱۵ء نیز شکوہ آبادی از بدر لکھنوی

ہیں :-

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا
زیرِ غربت شکر فروشوں کو ملا
جب لختِ جگر کھا کے لگی پیاس منیر
کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

آخرش نواب علی بہادر پکڑے گئے ۔ مگر حکومت نے اُن کے ساتھ یہ رعایت برتی کہ اندور میں نظر بند رہے ۳۶۰۰ روپیہ سال مقرر کر دیئے گئے ۱۸۶۲ء میں بمبئی بلائے گئے ۔ گورنر کے دربار میں جگہ ملی آپ کے فکرِ سخن سے ایک غزل پیش ہے :-

ترے خدنگِ ادا کا وہی نشانہ ہوا
کہ جس کے عشق سے تو آفتِ زمانہ ہوا
یہ کچھ نہ سوجھی کہ مجھ پر گزر گئی کیا کیا
نہیں تو وجہ مسرت میرا فسانہ ہوا
یہ کیا کیا جو کیا دعوئے وفا نواب
کہ اس کو اور جفا کے لئے بہانہ ہوا

نواب نے سنہ ۱۲۹۰ھ میں انتقال کیا ۔ جناب منیر نے یہ قطعۂ تاریخ لکھا :-

نواب علی بہادر اے بحرِ کرم
یوسفِ طلعت شجاعِ یکتا ہے ہے
اے قدر شناس و ناز بردارِ منیر
اے اہلِ سخن کے عزت افزا ہے ہے
اے صدر نشینِ خلق و اقبال و شکوہ
اے بزمِ کرم معنی مسند آرا ہے ہے
اٹھ جائے جوان تو زمانہ سے ہائے
صد حیف افسوس و دریغا ہے ہے
تاریخ تری یہ رو کے کہتا ہے منیر
فیاضِ زماں امیرِ زیبا ہے ہے

حالاتِ قیدِ فرنگ

فرخ آباد اور یارانِ شفیق — چھُٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے
آئے باندے میں مقید ہو کے ہم — سو طرح کی ذلت و تحقیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثلِ قبر — تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
پھر الہ آباد لے جائے گئے — ظلم سے تلبیس سے تزویر سے
جو الہ آباد میں گزرے ستم — ہیں فزوں تقریر سے تحریر سے
پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں — گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں — ناتواں تر قیس کی تصویر سے

سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے
تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے

کالا پانی | انڈمان میں زیادہ وقت مولانا فضلِ حقؒ کی صحبت میں گزرتا تھا چنانچہ آپ کے متعلق ایک قصیدہ میں کہتے ہیں ؎

رشکِ زلیخا ہوئی بحرِ صفت جوش زن
غرق ہوا نیل میں یوسفِ گل پیرہن
مخزنِ فضل و کمال عالمِ عالی مقام
ناقدِ تازی زباں فیض شناسِ سخن
مولوی بے نظیر فضلِ حق اسمِ شریف
دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و مؤتمن

قید میں، میں اور وہ رہتے تھے ایک ہی جگہ
عین سمندر میں تھے غرقۂ بحرِ محن
نصف قصیدہ کیا ہے میں نے انکے سامنے رقم
ختم ہوا جب، تھے وہ ہمدمِ گور و کفن

تاریخ پھانسی نوابان فرخ آباد جو انڈمان میں کہی

اقبال مسند خاں، و غضنفر حسین خاں
دونوں دُرِ محیط عطا آہ آہ ہائے!
دونوں جوان نیک امیرانِ ذی حشم!
مقتولِ تیغ تیرہ قضا آہ آہ ہائے
تاریخ اُن کے قتل کی کافی ہے یہ منیرؔ
دونوں شہید راہِ خدا آہ آہ ہائے!
۱۲۷۴ھ

تاریخ پھانسی نواب سخاوت حسین خاں برادرِ کوچک نواب تفضل حسین خاں مسند نشین فرخ آباد

ریاضِ خلق سخاوت حسین خاں نواب
نہالِ باغِ کرم زیبِ مسندِ شوکت
جوان قابل و فرزند خاص نصرت جنگ
غلامِ آلِ نبی سروِ قمر طلعت

وہ بے گناہ ہوا تیغ مرگ سے مقتول
عنایت اُس کو کیا حق نے گلشن جنت
منیرؔ نے یہ کہی اُس کے قتل کی تاریخ
ہوا شہید امیرِ دلیر باہمت
۱۲۷۶ھ

آپ بیتی

تھے قید ہم جزیرۂ دریائے شور میں
نیرنگ گردشِ فلکِ نیلہ رنگ سے
منشی تھے محکمہ میں کمشنر کے ہم وہاں
محفوظ تھے مشقتِ بیل و کلنگ سے
انعام میں معاف ہوئے ہم کو دو برس
شکرِ خدا رہا ہوئے کام ہنگ سے
ہندوستاں میں آکے رہے ہم پراگ میں
اب کانپور جاتے ہیں دل کی امنگ سے
فضلِ خدا سے سالِ رہائی کہو منیرؔ
اب ہم گھر آئے چھوٹ کے قیدِ فرنگ سے

واقعہ الہ آباد میں بعد فرد ہونے ہنگامہ کے جلسہ خیرخواہانِ برطانیہ کا منعقد ہوا۔ اس میں نواب یوسف علی خاں رئیس رام پور بھی شرکت

کی غرض سے الہ آباد آئے یہاں ایک گویّا جو واجد علی شاہ کے پاس رہ چکا تھا. لکھنؤ سے الہ آباد آگیا اور رہ پڑا. نوّاب صاحب کے یہاں شام کو محفلِ سرود منعقد ہوئی اس میں یہ گویّا بھی طلب ہوا۔ اس نے گانے میں منیرؔ کی مشہور غزل سنائی۔ ع

شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

نوّاب نے سن کر اثر لیا اور اسی ردیف وقافیہ میں فرمایا ؎

تا آئے منیرؔ یہاں ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

نوّاب کو معلوم ہوا منیرؔ انڈمان میں ہیں تو گورنمنٹ میں لکھا پڑھی کرنے لگے۔ اُدھر منیرؔ کو چھ سال گزر چکے تھے۔ قصیدے نعتیہ کہے. مناجاتیں کہیں۔ ساتواں سال بھی نصف ختم ہونے کو ہوا۔

ایک قصیدہ جناب رسالت مآب کی شان میں کہنا شروع کیا۔ اس میں التجا کی ؎

اسی ذی الحجہ تک مطلب میرے دل کے عنایت ہوں
کرے اب کا محرّم ہند میں یہ بندہ جانی

رہائی

بارے آئی نجات کی باری — کھُل گیا عقدۂ گرفتاری
ہم کو منصب ملا رہائی کا — قید کو جائزہ دے کاری

کوچ ٹھہرا مقام غربت سے
اب وطن چلنے کی ہے تیاری

رخصت اے دوستانِ زندانی
الوداع اے غمِ گرفتاری

الرحیل اے دوستانِ زندانی
الفراق اے ہجومِ ناچاری

دال، چاولوں سے کہدو رخصت ہوں
پانی میں ڈوبے یہ نمک کھاری

مچھلیوں سے کہو کہ ہٹ کے سڑیں
گھاس کھودے یہاں کی ترکاری

چینی، برمی، ملائی، مدراسی،
اہلِ آسام، جنگلی، تاتاری

اپنے دیدار سے معاف کریں
اپنی باتوں سے دیں سبک باری

کالے پانی سے ہوتے ہیں رخصت
اشکِ شادی ہیں آنکھوں سے جاری

بیٹھتے ہیں جہاز دُودی پر
اُٹھتے ہیں لنگر گراں باری

نکلے دریائے شور سے صد شکر
بحرِ شیریں کی آگئی باری

نظر آیا سوادِ کلکتہ
شکر ہے شکر حضرت باری

کیا منیر اور التماس کرے
فکر قاصر ہے نطق سے عاری

دیگر

آج میں نے قید سے پائی رہائی اے منیر
فضلِ حق سے یہ خوشی کی دوپہر مسعود ہو

اس جزیرے سے سوئے کلکتہ ہوتا ہوں رواں
اے خدا ہندوستاں کا اب سفر مسعود ہو

آ کے بیٹھا ہوں جہازِ تیز رو پہ شکر ہے
لنگر اٹھا ساعتِ فتح و ظفر مسعود ہو
مادّہ منظور ہے کہنا دعائیہ مجھے
نیک ساعت ہو، کواکب کی نظر مسعود ہو
آج کے دن کی ہے یہ تاریخ صوری معنوی
روز شنبہ ہم ماہِ صفر مسعود ہو
۱۲۸۲ھ

چنانچہ ۱۲۸۲ھ ۲۸ محرم میں قید انڈمان سے رہا ہو کے کلکتہ آئے۔ وہاں سے الہ آباد پہونچے میر غلام عباس رئیس کے یہاں ٹھہرے مثنوی معراج المضامین لکھی۔ عیال و اطفال کے مرگ کی خبر لگی۔ صدمہ جانکاہ ہوا۔ وہاں سے لکھنؤ آئے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے شعر پر تضمین کی۔

مشہورِ خلق آپ کی ہیں قدر دانیاں
حسب الطلب منیرؔ بھی آتا ہے اب وہاں
یہ حکم خاص ہے دل و جان پر مرے رواں
"ناظم منیرؔ آئے یہاں ہم ہیں قدر داں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے"

چل اے منیرؔ قبلۂ عالم ہیں قدر داں!
بلواتے ہیں حضورِ معظم ہیں قدر داں
وہ کہتے ہیں جو آج مسلّم ہیں قدر داں
"ناظم منیرؔ آئے یہاں ہم ہیں قدر داں"

شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

لیکن جب منیر رہا ہو کر آئے تو نواب یوسف علی خاں بہادر انتقال فرما چکے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ؎

آیا منیر چھوٹ کے جب قید سے یہاں
تھا قصد رام پور کو ہو جاؤں میں رواں
لیکن حضور ہو گئے راہی سوئے جناں
اب کس کے پاس جاؤں میں ہی کون قدرداں
نادم رہا میں اپنے کمالوں کے سامنے

لکھنؤ میں آغا علی حسن خاں نے دستگیری کی۔ کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جشنِ ولادت ولی عہد رام پور کی خبر ملی ایک تہنیت نامہ مع قطعات تاریخ عرضی کے ساتھ نواب کلب علی خاں کی خدمت میں ارسال کیا۔ نواب صاحب نے ازراہِ قدردانی ان کو طلب کر لیا۔ رام پور پہونچے ؎

نواب پاک کلب علی خاں نے اے منیر
بلوا کے رام پور میں کیں بخششیں کثیر
صد شکر آئے راہ پر اب طالع فقیر
ہے قدرداں سر پہ امیر فلک سریر
اب سرخ رُو ہوں اپنے کمالوں کے سامنے

نواب کلب علی خاں کا زمانہ رام پور میں عہدِ زریں کہنا سزاوار ہے علوم و فنون کی اشاعت کی سرپرستی کے ساتھ صنعتوں اور حرفتوں

کے رواج کی بھی ترقی تھی جس طرح ہر ایک علم و فن کے عالم جمع کیے گئے تھے۔ اسی طرح دستکاری کے ماہر فن فراہم فرمائے۔ مدرسہ عالیہ اور وابستگانِ دربار میں علوم عصریہ سے ہر ایک علم کے کامل الفن اور مسلم الثبوت استاد موجود تھے۔ مفتی محمد سعد اللہ مولانا محمد ارشاد حسین محدث۔ شمس العلماء مولانا عبد الحق خیر آبادی۔ مولوی عبد العلی ریاضی داں وغیرہ وہ لوگ تھے جن کی قابلیت کے ڈنکے چاردانگ عالم میں بج رہے تھے۔ حکماء میں حکیم ابراہیم لکھنوی۔ حکیم علی حسن خاں۔ حکیم حسن رضا خاں حکیم علی نقی خاں۔ حکیم ہادی حسن خاں لکھنوی یکتائے زمانہ تھے۔ شعراء میں منشی امیر احمد امیر مینائی۔ فصیح الملک نواب مرزا خان داغ۔ حکیم سید ضامن علی جلال۔ آفتاب الدولہ قلق۔ میر محمد ذکی بلگرامی۔ منشی مظفر علی خاں اسیر۔ احمد علی خاں عروج۔ منشی امیر اللہ تسلیم۔ انھیں میں منشی منیر کو شامل کیا۔ سو روپے ماہوار ملنے لگے۔ نواب کلب علی خاں کی فرمائش سے مدح ممدوح میں ایک قصیدہ کہا۔ اس کے چند دلچسپ مقامات پیش ہیں ۔

نواب سخن کلب علی خان بہادر
دنیا نہیں جس کی درِ دولت کے برابر
نواب سخن دوست سخن سنج سخنداں
افصح نہیں آج اس کی فصاحت کے برابر

رت ہے برسات کی بہت پیاری — موجزن جھیلیں۔ ندیاں جاری
بدلیاں چھا رہی ہیں گردوں پر — اودے اودے سنہری زنگاری
دیکھ تو رام پور کی برسات — کیا نمایاں ہیں قدرتِ باری

وصفِ علماء

علماء ایسے نامور ہیں یہاں
جن کی مداح خلق ہے ساری

حکمائے فلاسفہ کو بھی
فخر ہے ان کی کفش برداری

وہ اطبا ہیں عیسوی اعجاز
نام ہے جن کے بھاگے بیماری

فرد یکتا حکیم ابراہیم
کرے بقراط جن کی عطاری

حافظوں کا شمار حد سے فزوں
شرح کرنے میں حد کی دشواری

الغرض ہیں تمام اہلِ کمال
صاحبِ منصب نمک خواری

مجمعِ شاعرانِ نامی ہے
شاعری کی ہے گرم بازاری

بحر منشی، اسیر اور ساہر
ہمسرِ انوری و مختاری

طبعِ پاکِ عروج وداغ سے ہی
منفعل ابر کی گہرباری

ہے جلال و حیا و شاغل سے
محفلِ نظم جلوہ گرساری

مثنوی میں حیا و خواجہ بشیر
رونقِ شاعری و نثاری

فنِ تاریخ میں رسا منصور
جانؔ صاحب کی ریختی پیاری

سب سے بڑھ کر منیر کو حاصل
بے کمالی و ہرزہ گفتاری

رام پور میں منشی منیر کی آخری زندگی اچھی گذری۔

وفات | عمرِ طبعی پاکر ہیضہ میں مبتلا ہوئے۔ ۱۲۹۷ھ میں رام پور میں انتقال ہوا سالِ رحلت اس مصرع سے ظاہر ہوتا ہے ع

"انتقالِ منیر عالی قدر"

تصانیف (دواوین ہیں) منتخب عالم - تنویر الاشعار - نظم منیر - مثنوی معراج

۱۲۶۴ ۱۲۶۹ ۱۲۹۰

المضامین تیس ہزار اشعار کا مجموعہ و دیگر تصانیف۔

رسالہ اعلانِ حق - سراج المنیر - رسالہ تنبیہ الناشئین بفضائل الثقلین یادگار سے ہیں [عله]

[عله] مصنف

ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی

پہلی جنگِ آزادی میں ہندوستان کے جن محبانِ وطن نے جاں بازی اور سرفروشی کا مظاہرہ کیا تھا اُن میں دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی اور نانا راؤ پیشوا اور عظیم اللہ خاں کانپوری پیش پیش تھے۔ اور اس جنگ آزادی کے بانی مبانی یہی کہے جاتے ہیں۔ ان کے ہمراہیوں میں ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی بھی تھے۔ جن کو بہادر شاہ نے آگرہ کا لارڈ گورنر مقرر کیا تھا۔[1]

ڈاکٹر وزیر خاں بہار کے شرفائے افاغنہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد محمد نذیر خاں بڑے زمیندار تھے جنھوں نے ڈاکٹر صاحب کو علوم رسمیہ کی تعلیم دلا کر انگریزی تحصیل کرنے کے لئے مرشد آباد بھیجا۔ یہاں کچھ عرصہ رہکر فن ڈاکٹری کی تحصیل کے لئے انگلستان بھیجدئے گئے۔ وہاں سے اسٹیٹ سرجن کی ڈگری لی۔ مگر عبرانی اور یونانی زبان بھی سیکھ لی۔ اور معقول درک حاصل کیا۔ شوقیہ عیسوی مذہب کا مطالعہ کیا۔ انجیل و توریت مقدس کی شرحیں اور

---

[1] غدر کی صبح و شام۔ ذکر علماء، از مولوی اکرام اللہ گوپاموی (قلمی)

تفاسیر اور انجیل کے سو نسخے ہندوستان ساتھ لائے۔ کلکتہ کے بڑے اسپتال میں گورنمنٹ کی جانب سے اسٹیٹ سرجن مقرر ہوئے۔ پھر آگرہ میں تقرر ہوا۔ محلہ کاغذیان تاج گنج میں مقیم ہوئے۔ عمر کا حصہ دیا وہ نہیں گزرا مقامی اہل علم حضرات سے تعلقات تھے۔ مولوی مفتی انعام اللہ خاں گوپاموی وکیل صدر کے یہاں آتے جاتے۔ مولوی احمد اللہ مدراسی آگرہ آئے اور یہاں مجلس علماء کی بنیاد ڈالی۔[۱] اس کے ایک رکن ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو انگریز دشمنی اور حریت نوازی کا چسکا شاہ صاحب کے فیض صحبت سے پڑا۔

شاہ صاحب انگریزی حکومت کے خلاف میدان تیار کر رہے تھے۔ چنانچہ جی فارسٹر اپنی تصنیف انڈین میوٹنی میں لکھتا ہے۔

"اودھ کے باغیوں کی تجاویز اور سازش کی تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا اس مولوی کو انگریز حکام بحیثیت احمد شاہ فقیر اور صوفی عرصہ سے جانتے تھے۔ شمالی مغربی صوبہ جات میں ظاہرہ مذہبی تبلیغ کی خاطر پھر چکے تھے۔ لیکن فرنگیوں کے لئے یہ راز ہی رہا۔ اپنے سفر کے دوران میں ایک عرصہ تک وہ آگرہ میں مقیم رہے۔ حیرت انگیز اثر شہر کے مسلم باشندوں پر تھا شہر کے مجسٹریٹ ان کی جملہ نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے۔ عرصہ

---

[۱] بیاض منشی اعظم علی اعظم اکبرآبادی قلمی [۲] داستان تاریخ اردو از پروفیسر حامد حسن قادری۔

بعد یقین ہو گیا کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف ایک سازش کر رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کو کسی باغیانہ جرم میں ملوث نہ پایا گیا۔ وہ آزاد رہے!

غرضکہ شاہ صاحب نے علماء کی مجلس جس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے قائم کی تھی وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کو ختم کرنا تھا۔ اس مجلس میں مولانا غلام امام شہید۔ مفتی انعام اللہ خاں۔ مولانا محمد قاسم دانا پوری۔ مولوی کریم اللہ خاں بہادر صدر الصدور۔ مولوی حافظ ریاض الدین مفتی شہر۔ مولوی امام بخش وکیل۔ مولوی منصب علی۔ مولوی اعتقاد علی۔ مولوی عظیم الدین حسن۔ مولوی محمد باسط علی۔ مرزا اسد علی بیگ۔ مفتی عبدالوہاب گوپاموی۔ مولوی نور اللہ آباد گوپاموی۔ مولوی نور الحسن۔ مولوی طفیل احمد خیرآبادی سے حضرات تھے[1]۔ اس مجلس پر حکومت ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتی تھی۔ مگر کچھ حضرات کو ایک مقدمہ میں پھانسنا چاہا۔ مگر نا کامیابی رہی۔ اس واقعہ کو وہابی گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے[2]۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ایک طرف راجہ نوابوں کو۔ دوسری طرف نصرانیت کی ترویج و اشاعت میں سرگرم سعی تھی۔ انگلستان سے بڑے بڑے علمائے عیسویت ہندوستان روانہ کئے جاتے۔ فنیس اعظم فنڈ ر ۱۸۵۳ء میں ہندوستان

---

[1] حیات دلاور جنگ از انتظام اللہ

[2] داستان تاریخ اردو۔

آیا۔ گورنروں کے یہاں قیام کرتا تھا۔ دلّی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اسلام کے خلاف وعظ کہا کرتا۔ یہ عربی فارسی کا عالم اور فن مناظرہ کا واقف کار ہی نہیں بلکہ بڑا شاطر تھا۔ اس کے فضل وکمال کا انگریزی اخبارات میں ڈھنڈورہ پیٹا جارہا تھا۔ ان دنوں عموماً علمائے کرام عیسوی مذہب سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ انجیل اور توریت کا مطالعہ تو کجا۔ پادری فنڈر اسلام پر جو اعتراض کرتا اس میں اُلجھ کر یہ علمار رہ جاتے۔ اس کو معلوم ہوا صدر قطات کیوجہ سے آگرہ علما کا مرکز بنا ہوا ہے.... اس کو خیال ہوا کہ اگر یہاں کے علمار کو مناظرہ میں شکست دیدی تو کثیر التعداد اہلِ اسلام اپنے مذہب سے منحرف ہو کر مشرف بہ عیسویت ہو جائیں گے۔ اس زعم باطل میں آگرہ آیا۔ اعلیٰ حکام صدر کے یہاں مقیم ہوا۔ اور مشاہیر علمار کو کھلا چیلنج دیا۔ مجلس علما میں مشورہ ہوا اور ڈاکٹر وزیر خاں نے پادری فنڈر کا چیلنج منظور کیا۔ اور اپنے دوست مولوی رحمت اللہ کیرانوی کو بلا بھیجا۔ وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی طرح شوقیہ مذہب عیسویت کا مطالعہ کئے ہوئے تھے۔ مولوی رحمت اللہ نے پادری فنڈر سے خط وکتابت کے ذریعہ مناظرہ شروع کر رکھا تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب آگرہ آئے اور چھلی اینٹ میں قیام پذیر ہوئے۔

پادری فنڈر کو ایک خط میں مولانا نے لکھا کہ جس مذہب کی طرف تم دنیا کو بلا رہے ہو۔ اور جس کتاب کو تم آسمانی صحیفہ کہتے ہو

لہ خطبات گرساں دی تاسی۔

وہ کتاب اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے اور تم جیسے پیشوایان مذہب عیسوی نے اپنی دینی کتاب "انجیل" میں بہت کچھ تحریف کردی ہے۔ آج دنیا میں دینِ عیسوی کی بنیاد کھوکھلی ہے[1]۔

شروطِ مناظرہ میں یہ شرط خاص اہمیت رکھتی تھی کہ اگر مولانا مرحوم پادری فنڈر کے ان اعتراضات کا جو وہ صداقتِ اسلام پر کرے جواب نہ دے سکیں تو مولانا مذہب عیسوی اختیار کرلیں۔ اور اس طرح اگر پادری فنڈر مولانا کے سوالات کا جواب نہ دے سکے تو وہ مسلمان ہو جائے گا۔

موضوعِ بحث میں جو معرکۃ الآرا مسائل مولانا کے ذمہ تھے۔ وہ رسول اللہ صلعم کی رسالت کا اثبات اور کلام مجید کا آج تک بلا تحریف اور تغیر و تبدل سے بالکل محفوظ من اللہ اور آسمانی کتاب ہونا۔

ابطال تثلیث کے ساتھ تحریف انجیل کا مدلل ثبوت پیش کرنا تھا۔

اس کے مقابلہ میں پادری فنڈر کو اثباتِ تثلیث اور یہ امر ثابت کرنا تھا کہ موجودہ انجلیں جو آج پادریوں کے ہاتھ میں ہیں یہ وہی صحائف آسمانی ہیں جو حضرت عیسٰی پر نازل ہوئیں اور ان میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی!

صدر سلطنت کے انگریزی حکام کو پادری فنڈر سے دلی ہمدردی تھی چنانچہ ان کی جانب سے مناظرہ کا بڑا انتظام کیا گیا۔ اخبارات سے اعلان عام تھا۔ دور دور سے علما اور پادری اس مناظرہ میں شریک ہونے کے لئے آئے۔

[1] اظہار الحق (عربی)

۱۸۵۶ء مطابق رجب ۱۲۷۲ھ میں مناظرہ کی مجلس منعقد ہوئی۔ مسٹر
راسمٹ حاکم صدر مسٹر کرسٹین سکرٹری ریونیو بورڈ مسٹر ولیم حاکم علاقہ فوجی مسٹر
لیڈلی مترجم اوّل برٹش گورنمنٹ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[1]
عمائدین شہر میں مولوی امیر علی شاہ۔ مولوی قمر الدین خاں مہتمم اسعد الاخبار۔
مولانا مولوی مظفر علی شاہ جعفری القادری۔ سید صفدر علی شکوہ آبادی۔ پنڈت
یگل کشور۔ مولوی فیض احمد بدایونی حضور احمد۔ امیر اللہ وکیل راجہ بنارس۔ امجد علی
وکیل سرکار۔ منشی ریاض الدین۔ سراج الحق ابن مولوی فیض احمد بدایونی۔ مولوی
معین الدین۔ سید باقر علی ناظم محکمہ دیوانی۔ مولوی کریم اللہ خاں بھرایونی
صدر الصدور۔ مفتی اسد اللہ خاں۔ قاضی القضاۃ خادم علی مہتمم مطلع الاخبار۔
سید حافظ حسین۔ حافظ خدا بخش۔ ڈاکٹر الہام اللہ گوپاموی۔ منشی افہام اللہ
ساحر۔ قاضی باقر علی خاں ہمدانی۔ راجہ بلوان سنگھ کاشی۔ مولوی سید مدد علی
تپش۔ مرزا زین العابدین عابد۔ محمد عبد الشہید گولوی۔ ڈاکٹر مکند لال۔ حکیم
فرخند علی گوپاموی۔ منشی اکرام اللہ گوپاموی۔ سید فضل حسین۔ ڈاکٹر وزیر الدین
فرخ آبادی۔ مولوی غلام امام شہید۔ مولوی غلام جیلانی۔ مولوی طفیل احمد
خیر آبادی۔ حکیم جواہر لال۔ غلام محمد خاں رہا۔ خلیفہ گلزار علی اسیر۔ حکیم غلام
قطب الدین خاں باطن۔ مولوی سراج الاسلام امام جامع مسجد و پیشکار صدر
شریک مناظرہ ہوئے۔

---

[1] نظام تعلیم از مولانا مناظر احسن گیلانی۔ [2] انجلاء الحق [3] داستان تاریخ اردو
بیخبر از انتظام اللہ شہابی [4] خمخانۂ جاوید حصہ چہارم

مجلسِ مناظرہ

نصاریٰ کی طرف سے پادری فنڈر مناظر اول فیبس فریخ مناظر دوم اور مسلمانوں کی طرف سے مولوی رحمت اللہ مناظر اول اور مناظر دوم ڈاکٹر وزیر خاں تھے۔ پادری نے اسلام پر چند اعتراض کئے۔ وہ مولوی رحمت اللہ نے باتوں باتوں میں دفعہ کر دئیے جس کا اثر تمام جلسہ پر اچھا پڑا۔ مولوی صاحب نے کہا پادری صاحب آپ کے شکوک کا ازالہ تو کر دیا گیا۔ میرے چند اعتراض ہیں، ان کا جواب مرحمت ہو پادری فنڈر کے لئے یہ پہلی بات تھی۔ ورنہ عموماً معترض یہی ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ مولوی رحمت اللہ نے انجیل کے کثیر التعداد نسخے مجلس کے سامنے کھول کر رکھ دئیے۔ کہ پہلے تو اختلافِ عبارت ملاحظہ ہو۔ اور اس سے بڑھکر ترجمہ میں جو تصرف کیا گیا وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

اس کے بعد مولوی صاحب موصوف نے ایک مدلل تقریر توریت اور انجیل کے محرف ہونے پر کی پادری صاحب بغلیں جھانکنے لگے فیبس فریخ کو ڈاکٹر وزیر خاں تقریر کا خلاصہ سناتے جاتے تھے۔ وہ انگریزی اور فریخ زبان بھی جانتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مولوی صاحب کے بعد جو جامع تقریر کی ہے تمام حکام پر اوس سی پڑ گئی۔ پادری گھبرا سا گیا۔ دلائل کا جواب بن نہ پڑا تو معترف ہوا کہ انجیل اور توریت محرف ہیں۔ اور میں اس کا مقر ہوں۔ مگر مسئلہ تثلیث میں تحریف نہیں ہوئی۔ علمائے مجلس اور حکام صدر کو حیرت تھی کہ جن کتب کو خود پادری صاحب محرّف مان رہے ہیں اس کے مسئلہ کو محرف

قرار نہیں دیتے۔ آخرش پادری صاحب کو شکست ماننا پڑی اور چپکے سے آگرہ سے روانہ ہو گیا۔ پھر ہندوستان ٹھہرا ہی نہیں۔ پادری فنڈر اور مولوی رحمۃ اللہ کے مابین خط و کتابت ہوئی۔ اس مجموعہ کو امین الدین ہندی نے شائع کیا روداد مناظرہ سید عبد اللہ اکبرآبادی نے شائع کی۔ "اثبات تحریف انجیل" وزیر الدین بن شرف الدین دہلوی نے فتح الملک مرزا فخر الدین بہادر ولی عہد بہادر شاہ کے صرفہ سے شائع کی۔ مگر انگریز حکام کو ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی رحمت اللہ مثل خار کھٹکنے لگے۔ چند ماہ بعد ہنگامہ ۱۸۵۷ء رونما ہو گیا۔ مولوی رحمت اللہ کی گرفتاری کا اشتہار جاری ہو گیا۔ مولوی صاحب نے حجاز کا راستہ لیا۔ اور وہاں بخیر و خوبی پہونچ گئے۔

مولوی صاحب ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ مولوی علی احمد کے ہمراہ تحصیل علم کے لئے شاہجہاں آباد آئے۔ مدرسہ مولوی محمد حیات میں قیام کیا۔ ان کے والد نجیب اللہ مرہٹہ سردار ہندو راؤ کے دیوان تھے۔ پھر لکھنؤ جاکر مفتی سعد اللہ سے تکمیل علوم عربیہ کی کی۔ اور ازالۃ الاوہام کتاب لکھی۔ حجاز جاکر مکہ میں مدرسہ صولتیہ قائم کیا۔ سلطان روم ایک سو پچیس روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ بعمر ۷۵ سال ۲۲ رمضان ۱۳۰۸ھ میں انتقال ہوا۔

ڈاکٹر وزیر خاں مردانہ وار میدان میں نکل آئے۔ آگرہ میں جو فوج فدائیوں کی آئی اس کی سرپرستی ڈاکٹر صاحب نے کی۔ انگریز قلعہ بند ہو گئے۔ یہ مولوی فیض احمد بدایونی کو ساتھ لے کر دہلی پہونچے۔ بہادر شاہ کا دربار

جمع ہوا تھا۔ بریلی سے جنرل بخت خاں آچکے تھے[1] وار کونسل بنی ہوئی تھی۔ مرزا مغل بخضر سلطان۔ جواں بخت۔ مرزا عبداللہ۔ حکیم احسن اللہ خاں۔ نواب زینت محل۔ مفتی صدرالدین خاں۔ مولوی امام بخش صہبائی اس کے ارکان تھے۔ ڈاکٹر بھی مجلس شوریٰ میں داخل کر لئے گئے۔ جنرل بخت خاں لارڈ گورنر تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ہمراہ لے لیا۔ مولوی فیض احمد مرزا مغل کے پیشکار مقرر ہوئے۔

جنرل صاحب نے انگریزی فوج کو جہاں مقابلہ ہوا شکست دی۔ مرزا مغل ایک معرکہ میں منہ کی کھا آئے۔ ادھر مرزا الٰہی بخش نے مرزا مغل کو گانٹھ لیا تھا اور خوف زدہ کر دیا تھا۔ کہ جنرل روہیلہ ہے نواب غلام قادر خاں کے خاندان سے ہے۔ بہادر شاہ اور تمہارے پردے میں انگریزوں کو نکال کر خود تخت نشین ہونا چاہتا ہے[2]۔ مرزا مغل کچے کان کے۔ دوست دشمن کو نہ پہچان سکے۔ جنرل بخت خاں نے ایک مورچہ خود سنبھالا۔ دوسرا مورچہ کشمیری گیٹ کا مرزا مغل کے سپرد کیا۔ مرزا نے وقت پر ہمت ہار دی۔ جیتی ہوئی بازی ہاتھ سے جاتی رہی[2]۔

جنرل نے یہ رنگ دیکھ کر ڈاکٹر وزیر خاں سے کہا اپنی فوج کو علیحدہ کر لو۔ اور اپنے ہمنوا جو ہوں اُن کو ساتھ لو۔ یہ مغل بچے انگریز سے

---

[1] جنرل بخت خاں روہیلہ از سیدہ انیس فاطمہ بریلوی (رسالہ مصنف علی گڑھ)

[2] دلّی کی جانکنی ص۳ داستان غدر

سازباز کر گئے۔ نتیجہ یہ نظر آتا ہے کہ ہم سب یہیں کھیت ہو کے رہ جائیں گے
مقبرہ ہمایوں جا کر بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوا۔ اور سب حال
عرض کیا۔ اور کہا آپ میرے ساتھ چلئے۔ مگر نواب زینت محل نے بادشاہ
کو اس کی ہمراہی کے لئے آمادہ نہ ہونے دیا۔ آخرش جنرل صاحب دلّی
سے روانہ ہو گئے۔ اس کے جاتے ہی مقبرہ ہمایوں میں بہادر شاہ گرفتار
کر لئے گئے۔ مرزا مغل اور خضر سلطان کو ہڈسن نے گولی کا نشانہ بنایا۔
مرزا خویش روپوش ہو گئے۔ جنرل صاحب اور ڈاکٹر صاحب لکھنؤ آئے۔
حضرت محل کے مہمان ہوئے۔

یہاں دو دربار جمتے تھے۔ ایک مرزا برجیس قدر ابن واجد علی شاہ
کا۔ دوسرا مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی کا۔ شاہ صاحب کے یہاں
مجاہدین اور علما کا مجمع تھا۔ خدا اور اس کے رسول کی رضا جوئی مقصود
تھی۔ مرزا برجیس قدر کے یہاں ممو خاں کی طوطی بول رہی تھی۔ رشوت
کا بازار گرم تھا۔ ناچ رنگ کی محفلیں ہوتیں۔ غدارِ ملک و وطن ارد گرد
جمع تھے۔ انگریز سے سازباز کئے ہوئے تھے۔ جنرل بخت خان رنگ
دیکھ کر شاہ صاحب کے "علم" کے نیچے آ جمے[1]۔ نانا راؤ پیشوا کانپور سے آ گئے۔
عظیم اللہ خاں پہلے سے موجود تھے۔ مولوی لیاقت علی الٰہ آباد سے آ گئے۔
شہزادہ فیروز شاہ مرزا کوچک سلطان یہ سب حضرات مولوی احمد اللہ شاہ

---

[1] قیصر التواریخ حصہ دوم

کے دربار سے منسلک ہوگئے۔ شاہ صاحب نے انگریزوں سے کئی معرکے جیتے۔ مگر ممو خاں کی حماقت سے حضرت محل مرزا برجیس قدر کو محلات سے لیکر لکھنؤ سے باہر روانہ ہوئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز کو کامیابی ہوئی۔ شاہ صاحب مقابلہ کہاں تک کرتے انکیں بھی ہٹنا پڑا۔ شاہجہاں پور پہونچے۔ یہاں نواب قادر علی خاں ناظم شہر۔ نواب بہادر خاں نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں والئ بریلی کی طرف سے تھے[1]

نواب تفضل حسین خاں رئیس فرخ آباد اور جنرل اسمٰعیل خاں بھی یہاں آئے۔ شاہ صاحب نے تمام فوج منتشر کو یکجا کیا۔ اور ۲۸۔ اپریل ۵۸ء کو بھیوریہ کے قریب انگریزی فوج سے سخت مقابلہ کیا۔ سر کالن کیمبل فوج گراں سے آگیا تو سب کی رائے سے یہاں سے ہٹ کر محمدی پور کی گڑھی پر قبضہ کیا۔ اور اس کی ذہنی بندی کی گئی اور یہاں اپنی حکومت قائم کی۔ جنرل فوج بخت خاں مقرر ہوئے۔ قاضی سرفراز علی گورکھپوری قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ نانا راؤ اور شہزادہ فیروز شاہ وزیر مقرر ہوئے۔ سکہ مضروب ہوا۔

سکہ زد برہفت کشور خادم محراب شاہ
حامی دین محمد احمد اللہ بادشاہ

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں از مولوی سید الطاف علی بریلوی [2] قیصر التواریخ حصہ دوم

مگر شاہزادہ فیروز شاہ خود بادشاہت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ یہاں بھی دو ملاؤں میں مرغی حرام ہوگئی۔ حضرت محل اور ممو خاں نے سر کالن کمبل کی یلغار سے پریشان ہو کر نیپال کی طرف رُخ کیا حضرت شاہ صاحب راجہ بلدیو سنگھ رئیس پوائمن کی دعوت پر پوائین گئے۔ دھوکے سے گولیوں کا نشانہ بنے۔ یہ ۱۵۔جون ۵۸ء کا واقعہ ہے۔ سب ساتھی جدھر موقعہ ملا چلتے ہوئے۔ ڈاکٹر وزیر خاں حجاز روانہ ہو گئے۔ مکہ معظمہ جا کر مولوی رحمت اللہ کیرانوی کے پاس مقیم ہو گئے۔ اور اپنا مطب وہاں کھول لیا ایک عرب سردار عبد اللہ الیمنی سے تعلقات ہو گئے۔ اس کی بیوی سخت علیل ہو گئی۔ جانبر ہونے کی کوئی توقع نہ تھی۔ ڈاکٹر وزیر خاں کے علاج سے اس کو شفا ہوئی۔ عبد اللہ الیمنی نے ڈاکٹر صاحب کی مالی خدمت کرنا چاہی مگر آپ نے منظور نہ کی۔ عبد اللہ آپ کا بڑا معتقد ہو گیا۔ حکومت برطانیہ کا ہندوستان پر کامل تسلط ہو گیا تو اپنے باغیوں کی تلاش میں سرگرم سعی رہی۔ ہندوستان میں جو ہاتھ لگا پھانسی یا انڈمان کی سزا دی گئی۔ ڈاکٹر صاحب کی تلاش جاری تھی معلوم ہوا کہ وہ مکہ معظمہ میں ہیں سلطان عبد العزیز خاں سے مراسلات کا سلسلہ جاری کیا۔ اور لکھا ہمارا باغی آپ کے قلمرو میں ہے۔ اس کو ہمیں دیا جائے۔ سلطان نے شریف عبد اللہ امیر مکہ کو لکھا۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے اظہار

ئ تاریخ احمد منتظم از مولوی نسیم محمد نائب لکھنوی

کیا اور کہا کہ آپ کو بچانا میرے امکان سے باہر ہے۔ البتہ عبداللہ الیمنی سے آپ ملئے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب ان سے ملے۔ عرب سردار نے کہا ڈاکٹر صاحب دس ہزار عرب میرے قبیلہ کے ہیں۔ بچہ بچہ کٹ جائے گا جب کوئی آپ کو ہاتھ لگا سکتا ہے۔ اور شریف مکہ کو کہلا بھیجا کہ سلطان روم کو لکھ دیں کہ ڈاکٹر صاحب عبداللہ الیمنی کی امان میں ہیں کوئی آنکھ نہیں ملا سکتا۔ چنانچہ سلطان نے صاف انکار لکھ دیا کہ ڈاکٹر نہیں دیا جا سکتا۔ برطانیہ خاموش ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب نے عمر طبعی پا کر انتقال فرمایا۔ اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے "تحریف اناجیل" ایک مبسوط کتاب لکھی جس کا مسودہ ڈاکٹر محمد نفیس کے پاس راقم سطور کی نظر سے گذرا ہے۔

عظیم اللہ خاں

عظیم اللہ خاں ہندوستان کا وہ سپوت ہے جس نے حکومت انگلشیہ کے خلاف ایک محاذِ جنگ قائم کیا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار پر وہ کاری ضرب لگائی کہ اگر غداران ملک و وطن حکومت کا ساتھ نہ دیتے اور اپنوں کے ساتھ غداری نہ کرتے تو انگریز کبھی کے ہندوستان سے رخصت ہو چکے ہوتے۔ عظیم اللہ نے بہادر شاہ کو نظر انداز کر کے نانا راؤ پیشوا کو پیش پیش رکھ کر مرہٹہ طاقت سے کام لینا چاہا۔ مگر یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اور اس کو ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔ انگریز اس انقلابی شخص سے اس قدر خفا تھے۔ تاریخ میں مجبوراً ذکر تو کرتے ہیں مگر حقارت سے اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ عظیم اللہ خاں کو ایک غریب گھرانہ کا ہی نہیں بلکہ ادنیٰ درجہ کے خاندان کا فرد قرار دیا جاتا ہے۔ اور اس کو ایک اینگلو انڈین کے یہاں بوائے کی صورت میں پیش کر کے خانساماں بنایا جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے ذاتی شوق سے انگریزی پڑھتا ہے اور مشن کے فری اسکول میں داخل ہو کر معقول استعداد حاصل کرتا ہے۔ اور فارغ التحصیل ہو کر ماسٹر اس اسکول کا بن جاتا ہے۔

مگر مسٹر فارس میکل اپنے روزنامچہ میں محمد علی خاں عرف جے می گرین کے ذکر میں محمد علی خاں روہیلکھنڈی کی زبانی لکھتا ہے کہ۔

"میں نے اور عظیم اللہ خاں نے گورنمنٹ اسکول کانپور میں گنگا دین سے انگریزی کی تعلیم پائی تھی اور بعد کامیابی عظیم اللہ خاں ملازم اس اسکول میں ہوئے[1]"

عظیم اللہ خاںؔ ذہین اور تیز طبع تھے۔ بہت جلد مطالعہ سے استعداد فاضلانہ بڑھالی۔ تھوڑے عرصہ میں عظیم اللہ کی انگریزی دانی کی کانپور میں دھوم مچ گئی۔ جو گورنر کانپور آتا یہی ایڈریس اس کا لکھتے۔ غرضکہ حکام ضلع میں بڑا رسوخ ان کا ہوگیا۔ کلکٹر کانپور نے نانا راؤ رئیس بٹھور سے ان کی اعلیٰ قابلیت کا ذکر کیا۔ نانا صاحب نے عظیم اللہ خاں کو بلایا اور ان کی گفتگو کا اثر بہت کچھ لیا۔ کچھ عرصہ بعد عظیم اللہ خاں کو اپنا میر راہ کار بنا لیا۔ اور ان کی کارگزاری سے ایسا خوش ہوا کہ ان کے بغیر نانا صاحب کوئی کام ہی نہ کرتا۔

نانا راؤ

نانا صاحب کا نام مہاراج دھوندھو پنت نانا راؤ تھا۔ ان کے والد کا نام نادھو نرائن راؤ بھٹ موضع دیپڑدل علاقہ پونہ کے رئیس تھے۔ خاندان پیشوا سے منسلک تھے۔ آخری پیشوا باجی راؤ رئیس بٹھور کے پاس نادھو نرائن آئے۔ ان کے ساتھ نانا راؤ بھی تھے۔

---

[1] محمد علی خاں عرف جیمی گرین مصنف۔ مارچ ۱۸۵۳ء عظیم اللہ ابن عبداللہ خاں افغانی

ان کی عمر ڈھائی تین سال کی تھی۔ باجی راؤ کی گیارہ بیویاں تھیں۔ مگر اولاد میں صرف دو لڑکیاں باقی رہ گئی تھیں۔ اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے باجی راؤ نے مادھو نرائن سے نانا راؤ کو گود لے لیا۔ اور اپنا متبنیٰ بنایا اور ان کی تعلیم کا خاص طور سے انتظام کیا گیا۔ انگریزی تعلیم بھی پائی۔ باجی راؤ کا ۱۸۵۲ء میں انتقال ہوا۔ نانا صاحب کو اپنا جانشین مقرر کر گئے تھے۔ بٹھور کا علاقہ نانا صاحب کے قبضہ میں آیا۔ اور خزانہ بھی ملا۔ گورنمنٹ نے یہ رعایت روا رکھی کچھ سپاہ اور چھ توپیں اپنے قلعہ میں رکھ سکیں۔ مگر ۸ لاکھ سالانہ جو باجی راؤ کو ملتی تھی لارڈ ڈلہوزی نے بند کر دی۔ اور نانا صاحب کو ان کا جانشین نہ مانا۔ اور انکی جاگیر سے البتہ تعارض نہیں کیا۔ نانا راؤ نے حکام کے ذریعہ پنشن کھلوانی چاہی مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ عظیم اللہ خاں نے اس سلسلہ میں بہت دوڑ دھوپ کی مگر کوئی صورت کامیابی کی نہ نکلی۔ تو ہر دو صاحب میں یہ مشورہ ہوا کہ یہ مسئلہ انگلستان جا کر ڈائرکٹران کمپنی کے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۵۳ء میں عظیم اللہ خاں کو پانچ لاکھ روپیہ دیکر نانا صاحب نے ولایت روانہ کیا۔ محمد علی خاں روہیلکھنڈی ان کے ساتھ تھے۔ اور نانا صاحب کے بھائی بالا صاحب کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ انگلستان جا کر ایک اعلیٰ ہوٹل میں ٹھہرے۔ اور ڈائرکٹران سے عظیم اللہ خاں نے تبادلہ خیال کیا۔ اور لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کی۔ دعوتوں کا سلسلہ بھی قائم رکھا۔ مگر ڈائرکٹران نے صاف

جواب دے دیا[1] جس سے ان کو سخت نا امیدی ہوئی۔ پانچ لاکھ روپیہ بھی صرف کیا مگر سب بے سود رہا۔ وکلاء کو معقول معاوضہ دیا گیا۔ مٹھی بھی گرم کی گئی۔ اس زمانہ میں ایک وفد راجہ ستارہ کی طرف سے بھی انگلستان آیا ہوا تھا۔ اس کے سرگروہ رنگوجی باپوجی تھے۔ وہ بھی ناکامیاب رہے۔ عظیم اللہ اور رنگوجی دونوں نے مشورہ کیا کہ ہندوستان چل کر انگریز سے گلوخلاصی کی تدبیر ضرور کرنا چاہیئے۔ ورنہ جو ریاستیں ان کے دندان آز سے ابھی بچ رہی ہیں وہ تو محفوظ ہو جائیں گی۔ چنانچہ رنگوجی باپوجی ہندوستان لوٹ آئے۔ اور انھوں نے اس علاقہ میں اپنا کام شروع کر دیا۔

عظیم اللہ خاں کی حسنِ لیاقت اور شریفانہ طور طریق کی انگلستان میں بڑی دھوم تھی۔ اخبارات میں ان کو "پرنس آف ہند" لکھا جاتا۔ ان کی نوجوانی اور خوبصورتی نے امراء کی صاحبزادیوں کو ان کا متوالا بنا دیا۔ اُن کے عاشقانہ خطوط ان کے نام آنے لگے۔[2] مگر عظیم اللہ گو سب سے مراسم رکھتا تھا۔ اور ہر ایک کو اس کی محبت کا جواب محبت سے دیتا تھا۔ مگر کسی غلط راستہ پر اپنے کو لگنے نہ دیا۔ اور نہ کسی بُرائی کا دھبہ دامن پر آنے دیا۔ صرف عاشقانہ خطوط تک لطف اندوز ہوتا رہا۔ انگلستان سے فرانس آیا۔ یہاں بھی لعبتانِ فرانس اس کی گرویدہ ہو گئیں۔ مگر اپنے دامن کو آلودگی سے بچاتا ہوا قسطنطنیہ چلا گیا۔ یہاں سلطان عبدالعزیز کا زمانہ

---

[1] تاریخ بغاوت ہند صفحہ ۱۰۰۔ [2] یہ خطوط انڈین پرنس اینڈ دی انگلش کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

تھا۔ وہاں کے امرا اور ارا کین سلطنت سے ملا جلا۔ اس کے بعد کریمیا گیا۔
ان دنوں روس اور انگلستان اور فرانس سے جنگ ہو رہی تھی۔ لندن ٹائمز کے نامہ نگار مسٹر رسیل کے خیمہ میں عظیم اللہ فروکش ہوا۔ اور اس کے ساتھ سبٹاپول جو میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ جہاں سے نامہ نگار اور امرائے روس جنگ کا نقشہ دیکھ رہے تھے۔ یہ بھی وہاں بیٹھے۔ اتفاقاً ایک گولہ ان کے سامنے آکے گرا۔ ان کے پاس کے لوگ سب بھاگ گئے مگر یہ پُرسکون طور پر اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ جب گرد و غبار چھٹا تو مسٹر رسیل ان کو دیکھنے آیا کہ عظیم اللہ گولے سے مر چکا ہو گا۔ اس کی لاش کی تدفین کا انتظام کیا جائے۔ یہاں یہ حال دیکھا کہ عظیم اللہ اپنی کرسی کے پاس کھڑے ہوئے کپڑے جو غبار سے گرد آلود ہو گئے تھے بڑے اطمینان سے جھاڑ رہے ہیں۔ مسٹر رسیل اور اس کے ساتھی ان کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اور عظیم اللہ سے بولے آپ جب گولے سے بچ گئے تھے تو کیوں نہ بھاگے۔ عظیم اللہ نے کہا میں بزدل نہ تھا۔ جو واقعہ ہونے والا تھا ہو چکا تھا۔ عبث تھا کہ میں پھر جگہ چھوڑتا۔ جو روسی وہاں موجود تھے ان پر عظیم اللہ کے استقلال طبیعت کا بے حد اثر ہوا۔ اور وہ ان کے قیام گاہ پر آکر ملے۔ اور ان سے تعلقات قائم کئے۔ اور انکو آمادہ کیا۔ کہ ہندوستان میں انگریز کے خلاف قدم اٹھائیں۔ شاہِ روس ان کی معاونت کرے گا۔ چنانچہ کچھ روز رہ کر یہ قسطنطنیہ لوٹے اور مصر ہوتے ہوئے ہندوستان آ گئے۔ نانا راؤ سے تمام واقعات کہے اور نانا راؤ

کو آمادہ کیا کہ وہ بٹھور میں بیٹھ کر تمام نوابوں اور رجواڑوں کے پاس سفیر روانہ کرے۔ چنانچہ نانا راؤ نے کل اختیارات عظیم اللہ کو سپرد کر دیے۔ انھوں نے ایلچی ہر جگہ بھیجے۔ مگر راجہ اور نواب انگریزی اقتدار سے خوف زدہ تھے۔ جواب لکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مشورہ یہ ٹھہرا نانا راؤ اور عظیم اللہ جاترا کے نام سے تمام ہندوستان کا دورہ کریں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ان کی جماعت کا بڑا رکن سردار مرہٹہ تھا جیز تانتیا ٹوپے اور اس کا باپ سری پانڈورنگ راؤ بھٹ تھے۔ نانا صاحب کی دختر نیک اختر مینا بائی جو عظیم اللہ خاں کی شاگرد تھی وہ بھی ہمنوا تھی۔ باپ سے زیادہ اس کے دل میں انگریز دشمنی تھی۔ تانتیا ٹوپے نے فقیرانہ لباس اختیار کر کے ملک کا دورہ کیا۔ اور اپنے چیلوں کو فوج سرکاری میں چھوڑ دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ مولوی احمد اللہ شاہ نے اکبر آباد میں علمار کی ایک جماعت بنا لی تھی۔ پیری مریدی کا سلسلہ قائم کر کے انگریز کے خلاف خفیہ طور پر کام کر رہے تھے۔ ظاہرہ مذہبی تبلیغ تھی۔ باطن میں کمپنی کے اقتدار کا خاتمہ کرنا تھا عظیم اللہ بھی شاہ صاحب سے مل چکا تھا۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزی حکومت نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے اودھ میں عام بے چینی پیدا کر دی تھی۔ اس کے وزیر علی نقی خاں نے کلکتہ جا کر فوجوں میں بغاوت پھیلانے کا انتظام کر لیا تھا۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا بارک پور میں منگل پانڈے نے اعلانیہ بغاوت کا اظہار کر نا شروع کر دیا جس کی وجہ سے فوجی قانون کی رو سے گولی کا نشانہ

لینا پڑا۔ عظیم اللہ اور نانا راؤ کا دورہ کامیاب رہا۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ پونا۔ وغیرہ غرضکہ۔ جہاں جہاں گئے وہاں شورش کے انتظامات ہو گئے۔ ۲۰ جون جنگ آزادی کا دن مقرر کیا گیا تھا۔ مگر میرٹھ میں ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہی فوج میں بغاوت انگریز کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نانا راؤ اور عظیم اللہ کانپور میں تھے ان کو اس دن اطلاع اس واقعہ کی مل گئی۔ یہ کچھ فوج لے کر دلّی روانہ ہوئے۔ کلیان پہونچے تھے عظیم اللہ نے کہا جگہ جگہ شورش ہونا چاہیئے۔ دلّی کو ہی مرکز نہ بنایا جائے۔ چنانچہ کانپور لوٹ کر بٹھور میں جھنڈا اپنی حکومت کا لہرایا۔ نانا راؤ کو گدی نشین کیا گیا۔ اور مہاراج سے خطاب کئے گئے۔ توپوں کی سلامی شاہانہ ہوئی۔ نانا صاحب نے عدالت مقرر کی جس کے ارکان میں عظیم اللہ خاں۔ بابا بھٹ جوالا پرشاد جج مقرر ہوئے۔ اور نانا صاحب نے یکم جولائی کو دربار کیا جس میں عظیم اللہ کو وزالسرائے مقرر کیا گیا۔ پھر کانپور آکر کل علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ جنرل ویلر نے اسپتال کو دمدمہ سے مضبوط کر کے بطور قلعہ کے استعمال کرنے لگے۔ انگریز وہاں جمع کرے۔ آخرش نانا صاحب کی فوج نے انگریزی فوج پر حملہ کر دیا۔ فوج کی کمان مینا بائی اور تانتیا ٹوپے کے ہاتھ میں تھی۔ ۲۸ دن معرکہ رہا۔ آخرش جنرل نے مینا کے ذریعہ امان طلب کی۔ عظیم اللہ اپنے سردار دل کو لے کر جنرل ویلر سے ملے اور عہد و میثاق ہوا۔ چنانچہ سات کشتیوں پر اسلحہ حرب اور ضروری اسباب لادا گیا۔ جنرل صاحب ایک کشتی میں بیٹھے۔ بقیہ میں کچھ انگریز زن و مرد بیٹھے۔ بقیہ بیٹھنا چاہتے تھے بالا صاحب گو کھلے

ملہ قیصر التواریخ

نے فسخ عہد کیا اور کشتیوں پر گولیوں کی باڑ ماری۔ جو گھاٹ پر تھے تہ تیغ کیے گئے۔ جنرل وہلر بچ کر الہ آباد پہنچ گئے۔

اس واقعہ سے تانتیا ٹوپے اور عظیم اللہ خاں اور مینا۔ نانا راؤ سے کبیدہ خاطر ہو گئے۔ عظیم اللہ کا پھر نام نانا راؤ کے ساتھ تاریخ میں نہیں آتا عظیم اللہ لکھنؤ آکر احمد اللہ شاہ کے ساتھ ہو گئے۔ انھوں نے بیلی گارد میں حصہ لیا عظیم اللہ کا بھی ایک دمدمہ تھا۔ جنرل اوٹرم سے مقابلہ کیا[۱]۔ عظیم اللہ کے اور تانتیا کے ہٹتے ہی نانا راؤ عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے[۲]۔ پندرہ ہزار فوج صرف رہ گئی تھی۔ جن انگریزوں کو پناہ دے رکھی تھی ان میں سے دو میموں نے اپنے حالات کی چٹھیاں الہ آباد بھیجیں۔ وہ راہ میں پکڑی گئیں۔ اس پر جھلا کر نانا راؤ نے سب قیدیوں کو گھاٹ کنارے پہونچا دیا۔ ۱۵۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل نیولاک کانپور پر متصرف ہو گئے۔ اور عملہ دخلہ ہو گیا۔ پھر عظیم اللہ مولوی احمد اللہ شاہ کے ساتھ شاہجہاں پور تک رہے۔ پھر نانا راؤ کے ساتھ نیپال چلے گئے۔ وہیں ۱۸۵۹ء میں انتقال ہوا[۳]۔

---

[۱] تاریخ بغاوت ہند صفحہ ۱۹۳ [۳] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۴۸

حالات مولانا جعفر تھانیسری

مولانا کا گھرانہ شرفا کا تھا۔ ۱۲ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس وقت تک تعلیم کا کچھ انتظام نہ ہو سکا۔ ماں ایک سلیقہ مند خاتون تھی۔ ان کی سرپرستی میں تربیت پائی۔ بعد شعور پر خود مولانا کو اپنی تعلیم کا خیال آیا۔ چنانچہ تھانیسر کے مدرسہ ابتدائی میں داخل ہوئے۔ وہاں کے مدرس عماد قیوم کی خانقاہ سے متعلق تھے۔ ان کا کام بچوں کی تعلیم اور اصلاح کا تھا۔ اس کا اثر مولانا کے قلب پر بھی پڑا۔ جب اچھی خاصی استعداد ہو گئی تو پیشہ عرضی نویسی اختیار کیا۔ طبیعت کا رجحان قانون کی طرف تھا۔ وکیل تک آپ سے مشورہ لیا کرتے۔ ایک طرف عرضی نویسی سے آمدنی پیدا کرتے۔ دوسری طرف اپنی استعداد علمی کو ترقی دیتے۔ کچھ عرصہ بعد اپنے قصبہ کے نمبردار کی حیثیت اختیار کر لی۔ مولوی ولایت علی کے مرید سے ملاقات ہوئی۔ اور مولانا جعفر خود پٹنہ گئے۔ صادق پور میں کچھ عرصہ قیام کیا اور مبلغین کی جماعت کے ایک رکن ہو گئے۔ مولوی یحییٰ علی نے اپنا شریک کار بنا لیا۔ چنانچہ تھانیسر آ کر انھوں نے بھی مولوی یحییٰ علی کی طرح کام شروع کر دیا۔

ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے۔

۱۸۵۷ء میں جب غدر شروع ہوا تو جعفر اپنے دس معتبر مریدوں کے ساتھ مجاہدین کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگ کے غیر مانوس کام میں بھی اس کی اعلیٰ قابلیت نے اس کو نمایاں کر دیا۔ اور اب وہ ان لوگوں میں شمار ہونے لگا جن کے پاس باغیانہ راز محفوظ رہ سکتے ہیں۔ دہلی میں جب باغیوں کی امیدیں خاک میں مل گئیں تو جعفر عرضی نویسی کے کام پر تھانیسر واپس آگیا۔[1]

مولانا جعفر نے اپنے حلقۂ اثر میں تبلیغ و اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس طرح بنگال کے صوبہ میں مرکزی جگہوں میں دارالاشاعت قائم تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن لکھنوی جو مولانا ولایت علی کے خلیفہ تھے۔ بعد تحصیل علم ضلع مالدہ جو جنوبی بنگال کا حصہ ہے اس طرف آکر قیام کیا۔ وہیں شادی کی۔ اور دیہات میں دورہ کر کے بدعات کے خلاف اصلاحی کام بڑے پیمانہ پر انجام دے رہے تھے۔ بیس پچیس برس کے بعد ان کے صاحبزادہ مولوی امیرالدین نے باپ کا کام سنبھالا۔ ڈاکٹر ہنٹر نے مولانا کے لئے لکھا ہے۔

"وہ سرحدی کیمپ کے لئے پٹنہ مرکزی دارالاشاعت کو ہر سال روپیہ اور روئی بھیج دیتے تھے۔[2] مولانا بھی مقدمۂ سرکار کے لپیٹ میں آتے آتے رہ گئے"۔

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ۱۳۹

[2] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۲۳

۱۸۶۳ء میں جب گورنمنٹ ہند نے سرحد میں پیش قدمی شروع کی تب اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستان سے سرحد کے تعلقات بالکل قطع کر دیئے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۰ء تک سرحدی محاربات کے دوران میں باشندگانِ ہند پر یکے بعد دیگرے مقدمات بغاوت چلائے گئے۔ ان مقدمات میں سب سے بڑے ملزمان پٹنہ کے خاندان کے لوگ اور ان کے مریدین اور معتقدین تھے۔

مولوی ولایت علی کے بڑے صاحبزادہ مولوی عبداللہ اپنے والد کے ساتھ ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ ان کے حقیقی چچازاد بھائی مولوی عبدالرحیم اور آخرالذکر کے حقیقی ماموں مولوی یحییٰ علی اور مولوی احمد اللہ اور مولانا محمد جعفر تھانیسری سب کے سب ۱۸۶۴ء میں اس جرم میں ماخوذ ہوئے کہ انھوں نے اپنے عزیزوں سے خط و کتابت رکھی۔ اور انہیں مالی امداد بھیجی۔ حالانکہ یہ سلسلہ ۱۸۲۴ء سے جاری تھا۔ جب کہ حکام گورنمنٹ خود مجاہدین کی ہنڈیوں کا روپیہ انھیں وصول کرا دیتے تھے۔ مولوی عبداللہ اور مولوی یحییٰ علی پٹنہ کے بڑے رؤسا میں سے تھے۔ اور اول الذکر گورنمنٹ کے مستقل خیر خواہ تھے۔ اور اس کی خدمت انجام دیتے تھے۔ بہر حال ان اصحاب پر اور ان کے ساتھیوں پر اور اسی قسم کے لوگوں پر جو سرحد سے تعلقات رکھتے تھے مقدمات چلا دیئے گئے[1]

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ از مولانا طفیل احمد صفحہ ۱۰۶

مولانا جعفر تھانیسری نے اپنی تصنیف کالا پانی میں اس مقدمہ کی جو کیفیت لکھی ہے اس جگہ اس کی نقل پیش ہے۔

تھانیسر آپ کے نام کا وارنٹ گیا۔ خبر ہونے پر دہلی آئے۔ وہاں سے علی گڈھ پہنچے۔ یہاں دو ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہو گئے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

"پارسن صاحب ہم تینوں آدمیوں کو ساتھ لے کر خوشی خوشی بسواری شکرم دہلی کو روانہ ہوا۔ شکرم میں سوار کرنے سے پہلے مجھ کو بیڑی ہتھکڑی طوق پہنا کر اور طوق میں بطور باگ ڈور اور زنجیر ڈال کر اور اس کا سرا ایک مسلح سپاہی پولیس کے ہاتھوں میں دے کر اس کو میرے پیچھے بٹھایا اور پارسن صاحب اور ایک دوسرا انسپکٹر پولیس میرے دہنے بائیں بھرے ہوئے طپنچوں کی جوڑیاں لے کر میرے بدن سے بدن ملا کر بیٹھ گئے۔ اسکے سوا پارسن صاحب بار بار مجھکو راہ میں کہتا ہوا آتا تھا کہ اگر تم ذرا بھی حرکت کروگے تو میں اس طپنچے سے تم کو مار دوں گا۔ علی گڈھ سے چل کر دہلی تک کھانا پینا تو درکنار کسی سخت ضروری حاجت کے واسطے بھی ہم نہ اُتارے گئے۔ جب نماز کا وقت آتا تھا تو میں بلا طلب اجازت تیمم کر کے بیٹھے بیٹھے اشاروں سے نماز پڑھ لیتا تھا۔ اور گاڑی بدستور چلتی جاتی تھی۔ اور وہ چپ چاپ میری نماز کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔ آخر بعد مصیبت اس حال سے لوہے میں جکڑے ہوئے ہم دہلی میں داخل ہوئے۔ جہاں لے جا کر زیر بنگلہ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس دہلی کے ہم کو

ایک دخانہ میں زندہ درگور بند کر دیا۔ دوسرے دن دہلی سے کرنال پھر کرنال سے انبالہ ہم کو لے گئے۔ جب ہم انبالہ میں پہنچے بہت رات جا چکی تھی۔ اسی طرح بے آب و دانہ ہم تینوں آدمیوں کو علیحدہ علیحدہ تین پھانسی گھروں میں بند کر دیا۔ جہاں ہم شروع اپریل تک برابر بند رہے۔ دوسرے دن فجر کے وقت پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ اور میجر ونکفیل صاحب ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس اور کپتان ٹالی صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ مثل یاجوج ماجوج کے میری کوٹھری میں آئے۔ اور مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمہ کا سب حال بتلا دو۔ تمہارے واسطے بہت بہتر ہوگا۔ میں نے کہا میں کچھ نہیں جانتا۔ اس وقت پارسن صاحب نے مجھ کو پہلے بہت دھمکایا۔ اور پھر مارنا شروع کیا۔ جب میری مار حد کو پہنچی اور میں گر پڑا تو ٹالی صاحب اور ونکفیل صاحب کوٹھری سے باہر کھڑے ہو گئے۔ اور جب اس قدر مار پر بھی میں نے کچھ نہ بتلایا تو وہ سب کے سب اس دن مایوس ہو کر چلے گئے۔ میں نے جب یہ کیفیت ظلم و تعدی کی دیکھی تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب مجھکو یہ لوگ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمہ کچھ رمضان کے روزے باقی تھے۔ دوسرے دن سے میں نے ان کی قضا رکھنی شروع کر دی۔

دوسرے دن جب میں روزے سے تھا علی الصباح پارسن صاحب پھر آیا۔ اور وہی کارروائی شروع کی۔ مگر تھوڑی زدوکوب کے بعد مجھکو اپنی بگھی میں بٹھلا کر ٹالی صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لے گیا۔ جہاں ہر دو دونوں صاحب یعنی ٹالی صاحب اور میجر ونکفیل صاحب بھی موجود تھے۔

اسدن انھوں نے میری بڑی چاپلوسی کی۔ اور کہا کہ ہم تحریری عہد کرتے ہیں۔ کہ اگر تم دوسرے شہر کا۔ اور معاونین جہاد کو بتلا دو تو تم کو سرکاری گواہ کر کے رہا کر دینے کے سوا بڑا عہدہ بھی دیں گے۔ اور بصورت نہ بتلانے کے تم کو پھانسی ہوگی۔ میں نے اس چاپلوسی پر بھی انکار کیا۔ تو پھر انکار کیا تو پھر پارسن صاحب ان دونوں سے انگریزی میں کچھ باتیں کر کے مجھ کو ایک الگ کمرے میں لے گیا۔ جہاں لے جا کر پھر مارنا شروع کیا۔ میں کہاں تک لکھوں آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو۔ لیکن بفضل الہٰی میں سب سہار گیا۔ مگر اپنے رب سے ہر دم یہ دعا کرتا جاتا تھا کہ اے رب یہی وقت امتحان کا ہے۔ تو مجھکو اسوقت ثابت قدم رکھیو۔ جب وہ ہر طرح مایوس ہو گئے تو لاچار بعد آٹھ بجے رات کے مجھکو جیل خانہ کو واپس بھیج دیا۔ میں تمام دن روزے سے تھا۔ بنگلہ سے باہر نکل کر درخت کے پتوں سے روزہ افطار کر لیا۔ اور جیل میں پہنچکر جو میرے حصہ کا کھانا رکھا تھا اُس کو کھا کر اور شکر الہٰی کر کے سو رہا۔ دسمبر سے اپریل تک یہ سب دارو گیر ہو کر بماہ اپریل مجسٹریٹی ضلع انبالہ میں یہ مقدمہ پیش ہوا۔ اور ہم سب لوگوں کو پھانسی گھروں سے نکال کر کچہری میں لیجا سکے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ میرا حقیقی بھائی محمد سعید میرے اوپر اور محمد رفیع کا بھائی محمد شفیع (لاہوری)[1] کا اس کے اوپر پھانسی کی

(تواریخ عجیب صفحہ ۱۱۶)

---

[1] محمد شفیع لاہوری شمالی ہندوستان کے ایک بہت بڑے تاجر خاندان کا چشم و چراغ تھا۔

دھمکی سے گواہ ہو گئے اور اسی کارروائی سے پچاس ساٹھ آدمی جن میں اکثر مولوی ملاں تھے۔ ہمارے اوپر گواہ بنائے گئے۔ لیکن اکثر گواہ گواہی دیتے وقت بھی ہماری طرف دیکھ کر زار زار روتے جاتے تھے۔ مگر بے بس۔ اگر گواہی نہ دلویں تو قطع نظر مار پیٹ کے پھانسی کا سامنا تھا۔ اور یہ سب گواہ تا ادائی شہادت محکمہ سیشن کے مثل قیدیوں کے زیر حراست پولیس رکھے گئے تھے۔ اور پولیس ہی سے ان کو عمدہ خوراک اور لباس ملتا تھا۔ چنانچہ لاکھوں روپیہ سرکار کا ان بیجا کارروائیوں پر صرف ہو گیا۔ اور مار پیٹ کی تو یہ حالت تھی کہ عباس نام ایک لڑکا جو مدت تک میرے گھر میں رہ کر پرورش پایا تھا۔ جب مجسٹریٹ کے سامنے گواہی دیتے وقت مجھکو دیکھ کر مارے محبت کے جھوٹا اور آموختہ بیان میرے اوپر کرنے سے ہچکچایا تو اسی روز رات کو اس کو ایسی سزا سخت دی گئی کہ وہ بچہ اسی صدمے سے قبل از پیشی مقدمہ سیشن کے مر گیا۔ مگر رفع بدنامی کے واسطے پارسن صاحب نے اس کا مرنا کسی مرض سے مشہور کر دیا۔ جس دن ہم اوّل روز مجسٹریٹی میں حاضر کئے گئے تو میرا بھائی بھی بزمرہ گواہان زیر حراست پولیس تھا۔ اس نے مجھکو بذریعہ ایک سپاہی

یہ کمسریٹ کے ٹھیکہ دار تھے۔ ان کے والد اور دادا وارن ہیسٹنگیز اور لارڈ کارنواس کے زمانہ سے کمسریٹ کے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ محمد شفیع صاحب خیر شخص تھے۔ خیرات و مبرات میں معاصرین میں سبقت لے گئے تھے۔ مبلغین کی مالی معاونت کرتے رہتے۔ اسی بنا پران پر بھی مقدمہ چلایا گیا۔ اور انڈمان جانا پڑا۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۲۶)

پولیس کے یہ خبر بھیج دی کہ مجھ کو پولیس نے مار پیٹ کر تمہارے اوپر گواہ بنالیا ہے سو اب جب وقت برسر اجلاس میرے اظہار تحریر ہوں گے تو میں اپنے اُس بیان سے جو مار پیٹ کر لکھایا ہے پھر جاؤں گا۔ اس کے جواب میں میں نے اس کو کہلا بھیجا کہ میری قید اور رہائی کچھ تمہارے بیان پر موقوف نہیں ہے۔ وہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر تمہارا اظہار بحلف ہوا ہے تو اب اس سے پھر جانے پر بجرم دروغ حلفی تم کو سزائے سخت ہو جاوے گی۔ میں تو پہلے سے پھنسا ہوا ہوں۔ تمہارے پھنس جانے سے والدہ ضعیفہ صدمہ کھا کر ہلاک ہو جاوے گی۔ اس واسطے بہتر ہے کہ جو تم نے پہلے لکھایا ہے وہی اب بھی بیان کرو۔ لیکن باایں ہمہ جب اس کا اظہار میرے سامنے ہونے لگا تو وہ پہلے اظہار سے منکر ہو گیا۔ صاحب لوگ برسر اجلاس اُس کا انکار سن کر اوّل تو بڑے غصّے ہوئے۔ مگر بوجہ اس کی صغر سنی کے اُس کو کچھ سزا نہ دے سکے۔ اس کا نام گواہوں سے کاٹ کر اُس کو نکال دیا۔ کثرت گواہوں کے سبب سے ایک ہفتہ تک فقط یہی مقدمہ کچہری مجسٹریٹی میں پیش ہوتا رہا۔ صاحب لوگوں کا تعصب ہم لوگوں سے یہاں تک تھا کہ جب بروقت درپیشی مقدمہ کے ہم نے یہ درخواست کی کہ ہماری نماز کا وقت آگیا ہے ہم کو نماز پڑھنے کی اجازت بخشی جاوے۔ تو یہ اجازت بھی ہم کو نہ دی گئی۔ مگر وہ ہمارا کیا کر سکتے تھے۔ ہم نے عین دورانِ مقدمہ میں تیمم کر کے بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لی۔ ایک ہفتہ کی کارروائی کے بعد ہمارا مقدمہ سپرد سیشن ہوا۔ اسوقت تک ہم [illegible] علیحدہ

علیحدہ قید تھے۔ بعد سپردگی سشن کے ہم سب کو ایک جگہ حوالات میں بند کر دیا۔ اب بعد ایک مدت کے تنہائی اور چلہ کشی کے جو ہم سب دوست ایک جگہ جمع ہوئے تو بڑی مسرت ہوئی۔ سعدی کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتا ؎

پائے در زنجیر پیش دوستاں
بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

مگر ایک مدت دراز چار ماہ تک کے تخلیہ اور تنہائی سے بھی ہم لوگوں کو بہت روحانی فائدہ ہوا تھا انوار الٰہی آئینہ صافیہ قلب میں خوب محسوس ہوتے تھے۔ نماز روزے میں کمال لذت حاصل ہوتی تھی کہ شاید وہ کیفیت برسوں کی چلہ کشی اور گوشہ نشینی میں کبھی حاصل نہ ہوتی۔ اس وقت مولوی یحییٰ علی[1] صاحب کی صحبت ایک غنیمات سے تھی۔ اس کے ساتھ صبر و استقلال کے انعام کو خیال کر کے اوّل سے آخر تک میری زبان پر تو شکر ہی شکر جاری تھا۔

۲ مئی ۱۸۶۴ء کو پھر ایک آخری اجلاس سشن ہوا اور جج صاحب موصوف اپنی تجویز اور فتوے سزا اپنے گھر پر بیٹھ کر حسب ایما گورنر صاحب کے لکھ لائے تھے۔ اس دن اجلاس میں بیٹھنے کے ساتھ ہی پہلے چاروں اسیروں سے سشن جج صاحب نے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ لوگوں نے

---

[1] مولوی یحییٰ علی ابن مولوی الٰہی بخش عظیم آبادی سلف صالحین کا نمونہ تھے تبلیغ و اصلاح میں رئیس المجاہدین کہلاتے تھے درمنشور میں آپ کے تفصیلی حالات ہیں۔

اس مقدمہ کو اوّل سے آخر تک سنا۔ اب جو رائے ہو لکھ کر پیش کرو۔ ہم
نے دیکھا کہ یہ چاروں اسیسر اس وقت بھی ہماری شکلوں کو دیکھ دیکھ
آنسو بھر بھر لاتے تھے۔ اور دل سے ہماری رہائی کے خواہاں تھے۔ مگر
صاحب جج و کمشنر کی رائے کو ہماری سزا پر مائل پایا تو مارے ڈر کے
انھوں نے بھی لکھ دیا کہ ہمارے نزدیک بھی جرم مندرجہ فرد قرار داد ان پر
ثابت ہے۔ پھر تو صاحب جج و کمشنر نے بعد حصول اس حیلہ قانونی کے اپنی
تجویز جو پہلے سے میز پر لکھی ہوئی رکھی تھی پڑھنی شروع کی جس میں آئیں بائیں
شائیں کر کے پلوڈن صاحب کی عمدہ دلیل کا جواب تھا۔ اور سب سے پہلے
میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم بہت عقل مند اور بڑی علم اور قانون دال
اور اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس ہو۔ تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون
دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا۔ تمہارے ذریعے سے آدمی اور
روپیہ سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا۔ تم نے سوائے انکار کے کچھ حیلتا بھی
خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا۔ اور باوجود فہمائش کے اس کے ثابت
کرنے میں کچھ کوشش نہ کی اس واسطے تم کو پھانسی دی جاوے گی۔ اور
تمہاری کل جائداد ضبط سرکار ہو گی اور تمہاری لاش بھی تمہارے وارثوں
کو نہ دی جاوے گی۔ بلکہ نہایت ذلّت کے ساتھ گورستان جیل میں
گاڑ دی جاوے گی۔ اور آخر میں یہ کلمہ بھی فرما دیا کہ میں تم کو پھانسی
پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔ یہ سارا بیان صاحب موصوف کا
میں نے نہایت سکوت سے سنا۔ مگر اس آخری فقرہ کے جواب میں میں نے

کہا کہ جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے۔ آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ رب العزت قادر ہے۔ کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے لیکن اس جواب باصواب پر وہ بہت خفا ہوا۔ مگر پھانسی کا حکم دینے سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا جس قدر سزائیں اس کے اختیار میں تھیں سب دے چکا تھا۔ لیکن اس وقت میرے منہ سے یہ الہامی فقرہ ایسا نکلا تھا کہ میں تو اس وقت زندہ موجود ہوں۔ مگر وہ یہ حکم دینے سے تھوڑے عرصہ کے بعد ناگہانی موت سے راہی ملکِ عدم ہوا۔

مجھکو اپنی اس وقت کی کیفیت خوب یاد ہے کہ میں اس حکم پھانسی کو سن کر ایسا خوش ہوا کہ شاید ہفت اقلیم کی سلطنت ملنے سے بھی اس قدر مسرور نہ ہوتا۔ یہ حکم سنتے ہی میری وہ کیفیت ہوئی کہ گویا جنت فردوس اور حوریں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگ گئیں تھیں۔

میرے بعد مولوی یحییٰ علی صاحب اور ان کے بعد محمد شفیع (حسینی منشی عبدالغفار، منشی عبدالکریم، شیخ رحیم بخش۔ مولوی الہی بخش۔ قاضی میاں جان[1]) نمبر وار سب آدمیوں کو حکم سزا کا سنا دیا گیا جس میں میں (محمد جعفر) مولوی یحییٰ علی صاحب اور حاجی محمد شفیع تین آدمیوں کے واسطے پھانسی وغیرہ حسب مذکورہ بالا اور باقی آٹھ مجرموں کو دائم الحبس بعبور دریائے شور مع ضبطی کل جائداد کے سزا ہوئی۔ میں نے مولوی یحییٰ علی صاحب

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۴۹ و ۱۵۰

کو بھی نہایت بشاش پایا. لیکن محمد شفیع کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا. تاہم انھوں نے بھی اپنی طبیعت کو بہت تھاما. اس دن پولیس والے اور تماشہ بین مرد عورت بکثرت حاضر تھے. قریباً تمام کا تمام احاطہ کچہری ضلع انبالہ کا خلقت سے بھرا ہوا تھا. حکم سنا کر اس کا چپ ہونا تھا کہ صد ہا مسلح اہل پولیس زیر حکم کپتان پارسن صاحب میرے نزدیک آ کر کہنے لگا کہ تم کو پھانسی کا حکم ملا ہے تم کو رونا چاہیئے. تم کس واسطے اتنا بشاش ہو بہنے چلنے چلنے اس کو بولا کہ شہادت کی امید پر جو سب سے بڑی نعمت ہے اور تم اس کو کیا جانو. اس مقام پر یہ بات بھی بیان کرنا ضروری ہے، کہ پارسن صاحب بھی ایڈورڈس صاحب سے بڑھ کر متعصب تھا. اور اس مقدمہ میں شروع سے اس نے ہم لوگوں پر بہت ظلم کیا تھا کہ جسکی تفصیل یہ قلم بھی نہیں کر سکتی. مگر خداوند تعالیٰ منتقم حقیقی تو موجود تھا. گو اس کے کام دیر اور سہولیت سے ہوتے ہیں ہم کو سزا ہو کر تھوڑے دن گزرے تھے کہ یہ بخوف بھی دنیا میں پاگل ہو کر راہی ملکِ عدم ہوا. اس دن تماشہ بین لوگ ہماری پھانسی کا حکم سن کر اکثر زار زار روتے تھے. کوئی خدا کی مرضی اور راضی بقضا سے اپنے رنج کو روکتا تھا کوئی دم بخود ساکت ہو کر ہم کو دیکھ رہا تھا جیل خانہ تک بیسیوں مرد عورت ارد گرد سڑک کے ہمارا منہ دیکھتے چلے گئے. اسی حالت کے اندر پولیس ہم کو جیل خانہ میں لے گئی. اور وہاں پہنچ کر ہمارے کپڑے اور لباس معمولی اتار کر ضبط کر لئے گئے. اور ہم سب کو گیروالباس

پہنا دیا۔ ہم تین پھانسی والوں کو علیحدہ علیحدہ تین پھانسی گھروں میں بند کر دیا۔ باقی آٹھ آدمیوں کو جیل خانہ میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ ملا دیا۔

۲۔ مئی کی رات کو جب ہم ان تنگ تاریک کوٹھریوں میں جو نواب سراج الدولہ کے بلیک ہول قلعہ کلکتہ سے بھی بڑی ہوئی تھیں بند ہوئے تو پہلی ہی رات کو ایک جہنم کا نمونہ ہو گیا۔ اس کی صبح کو ہم نے اہالیانِ جیل خانہ سے اپنی یہ تکلیف بیان کر کے چاہا کہ کسی طرح ہم کو بوقت شب ان کوٹھریوں سے باہر رکھا جاوے۔ مگر سب اہالی جیل خانہ مارے ڈر کے انکار کر کے باہر چلے گئے۔ لیکن ان کا انکار کر کے جیل خانہ سے باہر نکلنا تھا کہ سامنے سے ایک سوار تار گھر سے ایک ضروری لفافہ لے کر پہنچا۔ لفافہ کھول کر جو دیا تو اس میں یہی لکھا تھا کہ ان تین پھانسی والوں کو بوقت شب میدان میں باہر سلایا کرو۔ یہ مرافہ تماشا تائیدِ الٰہی کا دیکھ کر اسی دم جیل خانہ والوں نے ہم کو یہ حکم سنا دیا۔ ہمارے واسطے بڑے اہتمام سے تین نئی پھانسیاں اور اس کے ریشمی رسے تیار ہوئے۔ اور ادھر مثل مقدمہ کو واسطے منظوری پھانسی کے محکمہ چیف کورٹ پنجاب میں بھیج دیا۔

۲۔ مئی ۱۸۶۴ء تاریخ سنانے حکم پھانسی سے ۱۶۔ ستمبر ۱۸۶۴ء تک ہم پھانسی گھروں میں بند رہے۔ اہالیانِ جیل ہمارے پھانسی دینے کا سامان تیار کر رہے تھے۔ اور ادھر ہم انگریزوں کا تماشہ بن رہے تھے صدہا صاحب لوگ اور میم روزانہ ہمارے دیکھنے کو پھانسی گھر وں میں

آتے تھے۔ مگر بخلاف دوسرے عام پھانسی پانے والوں کے ہم کو نہایت شاداں و فرحاں پاکر یہ یورپین زدارین ہیں بہت تعجب کرتے۔ اکثر ہم کو پوچھتے تھے کہ تم کو بہت جلد پھانسی ہوگی۔ تم خوشی کس واسطے کرتے ہو۔ ہم اس کے جواب میں صرف اس قدر کہہ دیتے کہ ہمارے مذہب میں خدا کی راہ میں ایسے ظلم سے مارے جانے پر درجہ شہادت کا ملتا ہے۔ اس واسطے ہم کو خوشی ہے۔

اب اس مقلب القلوب کی ظاہری کارروائی کو سنئے جب بہت سے صاحب میم ہم کو پھانسی گھروں میں نہایت شاداں اور فرحاں دیکھ گئے تو یہ چرچا سب لوگوں میں پھیلا۔ تب ان صاحب لوگوں نے جو ہمارے جانی دشمن تھے یہ خیال کیا کہ ایسے دشمنوں کو منہ مانگی موت شہادت جس کے واسطے وہ ایسا خوش ہو رہے ہیں دینی نہیں چاہئے۔ بلکہ انکو کالے پانی بھیج کر وہاں کے مصائب اور سختیوں سے ہلاک کرانا چاہیئے۔ ہم نے دیکھا کہ مطابق اسی ہماری پیشین گوئی کے صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ ۱۶ ستمبر کو پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور چیف کورٹ کا حکم ہم کو پڑھ کر سنا دیا کہ تم لوگ پھانسی پانے کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو۔ اس واسطے سرکار تمہاری دل چاہتی سزا تم کو نہیں دیوے گی۔ تمہاری پھانسی سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدل گئی۔ بمجرد سنانے اس حکم کے پھانسی گھروں سے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بارگوں میں ملا دیا۔ اور جیل خانہ کے دستور کے موافق مقراض[1] سے ہماری ڈاڑھی مونچھ اور سر کے بال وغیرہ سب تراش کر منڈی بھیڑ بنا دیا۔

---

[1] "کالا پانی" از مولانا محمد جعفر تھانیسری

مولانا کی روانگی انڈمان عمل میں نہیں آئی تھی کہ گورنمنٹ کو ان سے ایک کام لینے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ چنانچہ کمشنر نے مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری اور مولانا سے کہا کہ مولوی عبداللہ جو مولانا عبدالرحیم موصوف کے چچا زاد بھائی ہیں۔ افغانستان میں وہ مقیم ہیں۔ ان سے ہی سرکار کی جنگ بمقام انبلیہ ہوئی تھی۔ پیغام مصالحت کیا جائے۔ چنانچہ مولانا تھانیسری اور مولانا صادق پوری اور مولانا یحییٰ علی صاحب کو بصورت قیدی انبالہ سے لاہور جیل روانہ کیا گیا۔ ایک سال وہاں قیام رہا۔ اس کے بعد بسواری ریل روانہ ملتان ہوئے۔ ہفتہ عشرہ قیام کرکے روڑی بھکر سکھر جو سندھ میں واقع ہے جہاز پر سوار کئے گئے۔ کوٹلی پہونچے۔ وہاں سے بذریعہ ریل کراچی آئے۔ وہاں سے جہاز سے بمبئی پہونچے۔ پھر بذریعہ ریل بمقام تھانہ لائے گئے۔ یہاں بڑا قلعہ مرہٹوں کا تعمیر کیا ہوا تھا۔ جس کو جیل کے کام میں لایا جاتا تھا۔ یہاں چند ماہ ان اصحاب کو رکھا گیا۔ جیلر اور اہل کار شفقی صفت تھے۔ آٹھویں دسمبر ۱۸۶۵ء کو جہاز سے معہ دیگر قیدیوں کے روانہ پورٹ بلیر انڈمان مولانا ہوئے۔ صعوبات و تکالیف جہاز طے کرکے گیارھویں جنوری ۱۸۶۶ء یہ قافلہ جزیرہ انڈمان روانہ ہوا۔ یہاں منشی سید اکبر زماں اکبر آبادی ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے باغی علماء سے تھے۔ انھوں نے اپنے مکان میں لے جاکر رکھا۔ مولانا احمد اللہ و مولانا یحییٰ علی ایک جگہ رہے۔ میاں عبدالغفار بھی ان کے پاس رہے۔ منشی صاحب موصوف

نے ہر قسم کی معاونت ان صاحبوں کی کی۔ مولانا یحییٰ علی صاحب نے ۲۰ر فروری ۱۸۶۸ء کو انتقال فرمایا۔[1]

صادق پور پٹنہ کے مکانات جن میں جماعت کے لوگ ٹھہرتے تھے معہ مکانات مسکونہ کھدوا کر پھنکوا دیئے گئے۔ ۱۸۷۲ء کے آخر تک بہار اور بنگال میں گرفتاریوں کا سلسلہ جاری رہا۔ پٹنہ میں امیر خاں سوداگر چرم اور مولوی مبارک علی وغیرہ پٹنہ میں مولوی نصیر الدین صاحب اور اسلام پور میں ایک معمر ضعیف شخص ابراہیم منڈلی گرفتار کر لئے گئے۔ اور برائے گواہوں سے۔۔۔۔۔۔ گواہی دلوا کر کالے پانی روانہ کر دیا گیا۔ امیر خاں کی جائداد سے حکومت نے مقدمہ کا کل خرچ پورا کیا۔[2]

مولانا جعفر نے ایک نومسلمہ سے شادی کر لی۔ وہاں اُن کے اولاد ہوئی تفصیل کے لئے "کالا پانی" (تاریخ عجیب) دیکھئے۔

مولانا جعفر اور مولوی یحییٰ علی نے وہاں بھی درس قرآن وحدیث جاری رکھا۔ گھر گھر جا کر یہ لوگ نماز روزہ کی تلقین کرتے۔

مولانا احمد اللہ عظیم آبادی ابن مولوی الٰہی بخش رؤسا عظیم آباد سے تھے۔ مولانا یحییٰ علی کے بڑے بھائی۔ مولانا ولایت علی عظیم آبادی و دیگر اساتذہ سے تعلیم حاصل کی بشغل درس و تدریس رہتا حکام سے بھی

---

[1] درمنشور از مولانا عبدالرحیم صادق پوری [2] سیرت سید احمد شہید صفحہ ۴۲۲

تعلقات تھے ۱۸۵۷ء کی لپیٹ میں آتے آتے رہ گئے۔ پورٹ بلیر انڈمان میں اٹھارہ سال تکالیف و مصائب جھیل کر راہی ملک بقا ہوئے۔

جعفر اٹھارہ سال انڈمان رہے ۱۸۸۳ء میں مع رفقاء کے رہا ہو کر ہندوستان واپس آئے۔

تصانیف } مولانا نے "سوانح احمدی" اور "تاریخ عجیب" لکھی۔ اسکے علاوہ چند اور مذہبی رسائل مرتب کئے۔

مولانا نے طبعی عمر پا کر انتقال فرمایا۔ افسوس ہے اس مجاہد کی تاریخ وفات بھی تذکرہ نویسوں نے نہ لکھی۔

۱؎ سیرۃ سید احمد بریلوی صفحہ ۴۲۸

مولانا لیاقت علی الہ آبادی

مولانا جائل الہ آباد کے علمی گھرانہ کے ایک فرد محترم تھے علمائے عصر سے اکتساب علم کیا شغل درس وتدریس تھا علم طریقت سے بھی لگاؤ رکھتے تھے قادریہ سلسلہ کے شیوخ سے تھے جائل اور الہ آباد کے کثیر التعداد نفوس آپ سے بیعت تھے آپ نے الہ آباد آکر قیام کیا۔ تقدس مآبی کی شہرت تھی ہر شخص آپ کی عزت وتوقیر کرتا۔ اور سلسلہ بیعت میں داخل ہوتا۔ مولانا اپنے وعظ وتذکیر میں اقتدار نصارٰی پر تلمیحاً اشارہ کر جاتے۔ اور اپنے مریدین کو جہاد کی ترغیب وتشویق کی تلقین کرتے سرکاری فوج میں بھی آپ کے اثرات تھے عرصہ سے انگریزوں کے خلاف ملک میں تحریک شروع ہو چکی تھی عوام وخواص کے سوا فوج میں بددلی کے آثار تھے۔ میرٹھ میں انگریزوں نے جو سلوک فوجیوں کے ساتھ کیا تھا جس کا نتیجہ انقلاب ۵۷ء تھا اس کا اثر بھی الہ آباد کی فوج ۶ رجمنٹ پر بھی پڑا گو وہ خفیہ طور سے اپنا انتظام کر رہے تھے ایک دستہ سپاہ پیدل جس کا افسر رام چند تھا۔

اسنے اپنے افسر سے توپخانہ ہمراہ لیکر راج گھاٹ پر متعین ہوا۔ کپتان الگزینڈر نے پریٹ جاکر فوج سرکاری سے کہا جنگی سامان قلعہ میں بھیجدو یہاں پہلے سے انگریز معہ اہل وعیال کے پہنچ گئے تھے۔ فوج نے جنگی سامان بھیجنے سے انکار کیا ادہر راج گھاٹ کی فوج نے مار دھاڑ بھی شروع کردی کپتان الگزنڈر قتل کیا گیا[۱] کپتان پر یج اجیٹن قلعہ اور کپتان اتہس بھی تلوار کے گھاٹ اتار دئیے گئے پریٹ سے بگل جو بجا عام فوج پر سر پیکار ہوگئی۔ برل کی کوٹھی ڈاکخانہ اسمبلی۔ بیل صاحب کا بنگلہ میجر مورہواس اور مسز ہملٹن اور بامر کے بنگلوں میں آگ لگادی جسمیں یہ لوگ جلکر خاص سیاہ ہوگئے تمام بنگلوں کو لوٹا گیا۔

مولانا لیاقت علی صاحب نے سلطان خسرو باغ میں اپنے مریدین کو جمع کیا وہاں وطن پرست فوجی بھی جمع ہو گئے افسر رام چند بھی موجود تھے سبز جھنڈا بہادر شاہ کے نام کا لہرایا گیا رام چند کے کہنے سے مولوی لیاقت علی صاحب کو الہ آباد کا نواب مقرر کیا گیا۔ مولانا نے اپنے آدمیوں کے ذریعہ شہر کا انتظام کیا لوٹ کھسوٹ بند کی گئی۔ اور مولانا نے عوام کی آگاہی کے لئے اشتہار جاری کیا جسکا خلاصہ محاربہ عظیم صفحہ ۲۰۰ اسے نقل ہے۔ بعد حمد ونعت کے خادم الطلبہ واحقر الفقرا امیدوار رحمت رب غنی محمد لیاقت علی

[۱] محاربہ عظیم صفحہ ۱۹۶ -

الہ ابادی چند باتیں ضروری فرمان واجب الاتقان ہندو مسلمانوں کو سناتا ہے کہ جو بدعات ظلم و فساد ساری سلطنت ہندوستان میں کفرہ فجرہ نصارا کا قتل و غارتگری آتش زدگی و پھانسی و خونریزی اظہر من الشمس ہے...... صریح و ظاہر دیا ہر کہ ہندو مسلمان ہندوستان کے بسبب بے استطاعی زر و عدم موجودگی گولہ باروت و توپ و لشکر مجبور اور ناتوان ہو رہے تھے سو اس خالق احد اللہ الصمد نے سب سامان واسطے تسکین خاطر فاتر تم ضعفا و مسکینان کے نصارا بد اطوار سے بلا سبب و گولہ باروت و زر کثیر خصوصًا شفقہ عطیہ حضرت فرمانروائے کشور ہند ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی بادشاہ دہلی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ و عموماً امداد عساکر و اتواپ میگزین من جناب برجیس قدر ادام اللہ حشمتہم والی لکھنؤ۔ اور ہمراہی تمام راجگان قلمرو لکھنؤ و راجگان قرب و جوار الہ آباد وغیرہ اخلاق و اتفاق سارے ہندوستان میں باوصف ہونے اختلاف اقوام و مذاہب کے سو یہ دلائل کامل و براہین مدلال کمر بند اوپر اندفاع اس قوم نصارا طاغی باغی کے ہے مناسب ہے کہ جو بھائی ہندو مسلمان اس خبر فرحت اثر کو سنتے وہ فوراً مستعد ہو کر کمر ہمت باندھے اور قلعہ بند کفار نابکار کو قلع قمع کر کے بزور تیغ بیدریغ اپنے کے خاک میں ملا دیں۔ اور باقیماندوں کو اس ملک سے بھگا دیں۔ پھر باطمینان حکومت عدالت فرما دیں بسبب خوف طوالت یہ اعلان عام تمام کیا فقط

اس اشتہار نے صدہا ہندو مسلمان جھنڈے نیچے جمع کر دیے۔

جنرل نیل نے مولانا کی وطن پرست فوج سے آکر مقابلہ کیا اُسکو شکست اٹھانا پڑی ۱۲ جون کو پنجابیوں کی فوج اور گورا فوج آگئی مسٹر نیل اور ویلاک جائنٹ مجسٹریٹ نے مولانا کے ساتھیوں کو انعام واکرام کے لالچ دلا کر توڑ لیا۔ پھر جو حملہ ہوا مولانا تاب مقابلہ نہ لا سکے آخرش الہ آباد سے رخصت ہوکر لکھنؤ گئے[1]۔ اور مولوی احمد اللہ شاہ کے جھنڈے تلے آ جمے ۱۶ جون ۵۸ء کو انگریزی فوج اور سواری جہاز دخانی گنگا سے آگئی۔

اور الہ آباد پر گولہ باری کی شہر میں داخل ہوکر ممکن سے ممکن ظلم توڑے گئے اور قبضہ کر لیا۔ صدہا کو پھانسی لگی۔ اور بہت سے انڈمان بھیجدیئے گئے۔ مولوی احمد اللہ کی شہادت کے بعد مولانا بھی نیپال کی طرف تشریف لے گئے وہیں گرفتار ہوگئے۔ مقدمہ چلا انڈمان بھیجدیئے گئے کچھ دن بعد وصال ہوا[2]

---

[1] الہ آباد گزیٹیر صفحہ ۱۸۲ [2] تاریخ بغاوت ہند قیصر التواریخ حصہ دوم غدر کی صبح وشام ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما از انتظام اللہ شہابی۔

باغی شہزادہ

فیروز شاہ صاحب عالم مرزا ناظم بخت کے خلف اور شاہ ہند شاہ عالم ثانی کے پوتے۔ شہنشاہ فرخ سیر کے نواسہ تھے۔

صاحب عالم کی ماں راجہ جسونت سنگھ راہٹور کی صاجزادی اندر کنور تھیں۔ بیگمات شاہان مغلیہ۔ شجاعت اور تہور میں بے مثل تھیں۔ اس راج کماری کی شادی جس اہتمام اور انتظام سے زیر نگرانی امیر الامراحسن علی خاں ہوئی۔ شاہان مغلیہ کے یہاں نظیر نہیں ملتی علامہ عبد الجلیل بلگرامی نے اس کے حالات مثنوی کی صورت میں لکھے ہیں۔

نوید طوی شاہ ہفت کشور	جہاں را نو بہارے ریخت در بر
شہنشاہ سریر سر فرازی	خدیو عصر فرخ شاہ غازی

اندر کنور نے فرخ سیر کو قطب الملک کے ظالمانہ ہاتھوں سے بچانے میں جان کی بازی لگادی شمشیر زنی کرتے ہوئے شوہر پر نثار ہوگئی۔

مرزا ناظم بخت نے اپنے لخت جگر فیروز شاہ کو علوم مروجہ سے آراستہ کیا اور فنون حرب میں صاحبان فن سے طاق کرایا۔ مگر شہزادہ کی طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف بہت زیادہ تھا۔ اوراد و وظائف شب و روز کا مشغلہ تھا ۱۸۵۵ء میں حج بیت اللہ کے لئے گئے ۱۸۵۷ء میں

بعد ادائے فریضہ حج وطن مراجعت کی۔ ہندوستان آکر اندور آئے یہاں ہنگامہ بپا ہو گیا۔ حریت نوازوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف جنگ آزادی شروع کر رکھی تھی۔ حکومت کو ان کی آمد کا پتہ لگا۔ ان کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ مگر یہ گوالیار تک آ گئے یہاں کچھ عرصہ قیام کر کے دھول پور آئے کچھ لوگوں کو ساتھ لیکر تحصیل پر دھاوا بول دیا۔ اور تحصیلدار سے ایک لاکھ روپیہ وصول کیا۔ افغانی ملازم رکھے۔ باضابطہ فوج کی تشکیل کی بہ نیت جہاد بہت سے لوگ ان کے جھنڈے تلے خوشی سے آ گئے۔ دھول پور سے آگرہ کی طرف آئے انگریزی فوج نے کالی ندی پہ آکر مقابلہ کیا۔ اس کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ تمام انگریز مع فوج کے قلعہ بند ہو گئے یہاں سے کسی مصلحت سے شہزادہ میوات کی طرف چلا گیا۔ میواتی ہمنوا ہو گئے شیخ فضل علی رسالدار اور جنرل عبد الصمد خاں نے ہمنوائی کی۔ فرخ آباد کا رخ کیا۔ نواب تفضل حسین خاں سے ملتے ہوئے شاہجہاں پور پہونچے اور ساتھیوں کو ٹھہرا کر لکھنؤ آئے۔ اپنی عزیزہ سلطان بہو کے یہاں قیام کیا۔ حضرت محل نے تواضع و مدارت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا کچھ دن قیام کر کے ہمراہیوں سے آملے اور بریلی گئے۔ نواب خان بہادر خان نے بے رخی برتی تو سیدھے مراد آباد پہونچے وہاں کا ناظم خاں مذکور کا چچا تھا۔ وہ فوج لیکر مقابلہ پہ آ گیا اس سے جھڑپ ہوئی اور اس کی توپیں چھین لیں۔ اور مراد آباد پہ قبضہ کیا۔ نواب رام پور یوسف علی خاں کے بھائی کاظم علی خاں رام پور سے فوج گران لیکر آ گئے ہر دو میں مقابلہ ہوا

شہزادے نے یہ مناسب خیال کیا کہ مفت میں مسلمانوں کا طرفین سے خون بہیگا۔
بریلی لوٹ آئے پھر تو نواب خان بہادر خاں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور خود
استقبال کے لئے آئے۔ اور شہزادہ کو ہاتھی پر سوار کرا کر جلوس نکالا۔
انگریزی فوج بریلی پر حملہ آور ہوئی نواب تفضل حسین خاں نانا راؤ
پیشوا بھی شریک ہو گئے۔ رنگ بدل گیا۔ نواب خان بہادر خاں معہ
اہل و عیال کے پیلی بھیت چلے گئے۔ شاہزادہ تاب مقابلہ نہ لا سکا۔
شاہجہاں پور لوٹا یہاں مولوی احمد اللہ شاہ لکھنؤ سے ناکامیاب ہو کر
آ گئے تھے۔ یہاں بھی بڑا ہنگامہ رہا۔ حکیم محمد حسن خاں نبیرۂ نواب
محبت خاں شہید ہوئے مولوی احمد اللہ شاہ دلاور جنگ شاہجہانپور
سے ہٹ کر محمدی پور پہونچے اور اس پر قبضہ کیا اور گڑھی کو توپوں سے
آراستہ کیا۔ یہیں جنرل بخت خاں ڈاکٹر وزیر خاں نانا راؤ پیشوا عظیم اللہ خاں
مولوی سرفراز علی امیر المجاہدین نواب تفضل حسین خاں آ جمع ہوئے
مولوی احمد اللہ شاہ نے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اور سکہ
جاری کیا۔

شہزادہ خود بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ کبیدہ خاطر ہو کر
سندیلہ روانہ ہو گیا۔ سندیلہ پر قبضہ کرنا چاہا کامیابی نہ ہوئی۔
خیر آباد آئے۔ ناظم ہر پرشاد مولوی محمد ناظم بسواں اڑی پور راجہ
گلاب سنگھ رئیس بردا سے جھڑپ رہی تو محمد آباد آئے ظریف خاں
رسالدار اور ڈاکٹر وزیر خاں رفیق کار رہے جنرل اسمٰعیل خاں قاضی
عنایت علیخاں بریگیڈیر رفاقت ترک کر کے انگریزوں کے ساتھ ہو گئے۔

شہزادہ باڑی گیا اور گنگا پر پہنچکر کشتی سے پار اتر کے فرخ آباد آیا۔ اور مکن پور ہوکر اٹاوہ اور وہاں سے شیر پور کے گھاٹ سے اتر کر جے پور کی راہ لی اور بیکانیر کا رُخ کیا۔ پھر حیدر آباد پہونچے اور کابل کی طرف روانہ ہوئے۔ ایران۔ روس ہو کر حجاز چلے گئے[1]

مکہ معظمہ میں اقامت اختیار کی[2] یہاں مولانا رحمت اللہ کیرانوی حاجی امداد اللہ تھانوی شاہ عبدالغنی دہلوی مولانا یعقوب دہلوی۔ مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی مولانا محمد مظہر مجددی سے حضرات ہدایت و اصلاح کی ایک جماعت بنائے بیٹھے تھے۔ نواب فیض احمد خاں رئیس وتاولی۔ مولوی واعظ الحق بہاری حکیم نوازش حسین بہاری اور شہزادہ فیروز شاہ بھی اس جماعت کے رکن ہو گئے[3]

شاہزادہ مرزا سلیمان شاہ صوفی محمد ادریس صاحب میرٹھی کی معتقد تھے وہ بیان کرتے تھے کہ شاہزادہ مرزا فیروز شاہ نے ایک ترکی خاندان سے عقد کر لیا تھا۔ آپ سے دو لڑکیاں تھیں ہر دو فوجی افسران کو بیاہی گئیں ان سے ہی انور پاشا اور رفعت پاشا تھے۔ فیروز شاہ کی ایک بہن کلثوم زمانی بیگم تھیں جو ہنگامہ ۵۷ء میں قلعہ سے نکل کر فقیرانہ لباس اختیار کر کے میرٹھ چلی آئیں۔ نواب ممتاز علی خاں نبیرۂ نواب صواب اندیش خاں کے یہاں مقیم ہوئیں تمام عمر وہیں بتادی اور بھائی کے لئے دعائیں کرتی مریں۔

شاہزادہ فیروز شاہ کا انتقال ۱۸۹۵ء کے بعد ہوا[4]

---

[1] قیصر التواریخ حصہ دوم صفحہ ۲۶۸ [2] قیصر التواریخ حصہ دوم [3] ندائے حرم ۱۳۵۲ھ صفحہ ۹

بریلی کا نواب اور جنگ آزادی

نواب خان بہادر خاں ابن نواب ذوالفقار خاں خلف حافظ الملک حافظ رحمت خاں روہیلہ نواب بریلی بہادر خاں ۱۲۰۵ھ میں پیدا ہوئے امارت میں پرورش پائی مروجہ تعلیم سے واقف تھے حکومت انگریزی میں صدر الصدور بریلی کے ہو گئے اس سے پنشن لی حکام انگریز قدر و منزلت کرتے عوام میں بھی قبولیت تھی ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں جہاں دہلی لکھنؤ کانپور اور دوسرے مشہور شہروں میں حکومت کے خلاف انقلابی تحریک رونما ہوئی اس کا اثر بریلی پر بھی پڑا میرٹھ کے واقعہ سے یہاں کی فوجیں بھی منحرف ہو گئیں ۸-۱۸-۶۴ رجمنٹ میں حکومت سے بیزاری کے آثار پیدا ہونے لگے انگریزی حکام جو اپنے ظلم و جور کی وجہ سے عوام میں مقبول نہ رہے تھے۔ انہوں نے رنگ بگڑتا دیکھ کر نینی تال کی سدھ باندھی ۵۴ رجمنٹ فیروز پوری کے فوجی تمام وطن پرستی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہوں نے متذکرہ بالا رجمنٹوں کے فوجیوں کو تذبذب کی حالت سے نکالا اور ان کو ہموار کر لیا۔

مسٹر الگزنڈر کمشنر بریلی نے نواب بہادر خاں کو بلا کر کہا آپ کو چاہیئے کہ بریلی کی حالت کو سنبھالیں اور ہم آپ کو مسند نشین کئے دیتے ہیں نواب صاحب نے کہا میں ضعیف العمر ہوں اس

بار کو نہیں سنبھال سکتا۔ کمشنر نے نینی تال کا رُخ کیا۔ یہاں کے حکّام بے سردار ہو گئے اِدھر فوج میں حکومت کے خلاف تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی ۲۹ رمئی کو ایک توپ کا سر ہوتا تھا کہ تمام فوج لیس ہو کے اپنے افسروں کی خبر لینے پر پل پڑی گولیاں چلنے لگیں لفٹنٹ مارویل جان بچا کے بھاگا لفٹنٹ روجرز متعلقہ ۶۸ رجمنٹ کرنیل کونی ٹرپ کپتان ہیڈرسن کپتان چپ گھوڑوں پر سوار ہو نینی تال چلتے ہوئے ان پہ گولیاں چلیں مگر بچ گئے السائن ٹکرا ور بریگیڈیر سٹ بولا گولی کا نشانہ بنے۔

صوبہ دار توپ خانہ جنرل بخت خاں نے تمام فوجیوں کی کمان ہاتھ میں لی ان سب نے جھنڈا اسپر اپنا قرار دیا اور تمام عمائد شہر اور فوجی افسران کو جمع کر کے نواب بہادر خاں کو بریلی بلکہ کل روہیلکھنڈ کا نواب منتخب کیا۔

سوبھا رام دیوان ریاست مقرر ہوئے ۶ ہزار فوج اور ۸ توپیں جمع ہو گئی تھیں نیاز محمدؐ خاں جنرل بنائے گئے مدار علی خاں سپہ سالار کئے گئے مولوی خان اور عبدالرحمٰن خاں رام پوری افسر کمپو بنائے گئے ۔ منشی فرحت اللہ بخشی فوج اور شہر کوتوال اکبر علی خاں تھے۔

شاہجہانپور کی نظامت پر نظام علی خاں کو اور بدایوں کی نظامت فتح علی شاہ کو تفویض ہوئی۔ نانا راؤ پیشوا نے بٹھور سے اپنے بھائی ملہار راؤ کو نواب سے تعلقات پیدا کرنے کے لئے بھیجا۔ جنرل بخت خاں ملہار راؤ کو لے کر دہلی روانہ ہو گئے۔

شاہنشاہ ہند ابو ظفر بہادر شاہ نے نواب بہادر خاں کو انتظام الدولہ محافظ الملک خان بہادر ہزبر جنگ رئیس اعظم ملک روہیلکھنڈ خطاب عطا فرمایا۔ مُہر پر "الحکم اللہ والملک اللہ" کندہ ہوا۔

نواب صاحب نے شہر کا معقول انتظام کیا مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی دلاور جنگ کو لکھنؤ خط لکھا کہ بریلی آجائیے اور ۵۰ ہزار روہیلہ آپ کے جھنڈے کے نیچے رہیں گے یہاں انگریزی فوج سے مقابلہ کر لیا جائے گا۔ شہزادہ فیروز شاہ نانا راؤ پیشوا۔ نواب تفضل حسین خاں فرخ آبادی وغیرہ بریلی آگئے۔

روبرٹ سن جج۔ سشن جج ایر صاحب ڈپٹی کلکٹر پرنسپل مدرسہ مسٹر نیج ڈاکٹر ہنس پر وہتمم جیلخانہ کوارٹر ماسٹر سرجنٹ سنہری اسپنیل۔ لارنس صاحب مسٹر ڈیبوس مسٹر فلین مسٹر بیل مسٹر ایلون اس ہنگامہ میں کام آئے۔ ۵ رمئی ۵۸ء کو انگریزی فوج نے دھاوا شہر پر بول دیا۔ مانڈے خاں۔ جنرل اسمٰعیل خاں نواب ولی داد خاں شہزادے فیروز شاہ نے سخت مقابلہ کیا۔ پیشوا نانا راؤ اور نواب تفضل حسین خاں محمدی پور چلے گئے۔ غداران ملک نے ایسی غلط افواہیں اڑائیں نواب کے پیر اُکھڑ گئے اہل وعیال کو پیلی بھیت روانہ کیا اور خود معہ فوج کے مولوی احمد اللہ شاہ کے پاس محمدی چلے گئے شہزادہ مقابلہ پر ڈٹے رہے آخرش ان کو بھی محمدی کی راہ اختیار کرنا پڑی۔

قصبہ محمدی میں مولوی احمد اللہ شاہ نے حکومت قائم کر لی تھی

گڑھی کو توپوں سے آراستہ کر لیا تھا جنرل بخت خاں بھی آگئے تھے جتنے سردار فوج احرار کے تھے سب یہاں جمع ہو گئے تھے خان بہادر خاں پہنچ گئے تھے۔ شاہ صاحب کو راجہ پوائیں دعوت کے بہانہ لے گیا۔ اور دھوکہ سے شہید کر دیا لاش جلادی گئی سر کوتوالی شاہجہاں پور میں لٹکایا گیا تمام ساتھی نیپال چلے گئے۔ پھر تو اہل بریلی پر بڑی آفت آئی۔ ہزار ہا باشندے قتل کیے گئے۔ نو محلہ کے سادات کی حویلیاں کھدوادی گئیں۔ ۵۹ء میں دھوکہ سے خان بہادر خان گرفتار کر کے لکھنؤ لا کے گئے۔ حاکم کے سامنے پیش ہوئے آپ زمین پر بیٹھ گئے حاکم نے زبردستی سے کرسی پر بٹھایا اور ان کو شاہجہان پور بھیجدیا۔

جیل خانہ میں مقدمہ کیا گیا جج نے پھانسی کا حکم دیا جس دن پھانسی لگی فوج نے جیل خانہ گھیر رکھا تھا نواب صاحب سے پوچھا کسی بات کی تمنا ہو تو فرمائیے آپ نے مسکرا کر کہا مجکو کوئی تمنا نہیں اور یہ شعر پڑھا۔

بجرم کلمۂ حق میکشند غوغا ئیست ز مرگ زندگیم میشود تماشائیست

کلمہ پڑھا اور دار پر چڑھ گئے۔ لاش کو اُتار کر جیلخانہ کے پھاٹک میں دفن کی چہرہ کھلا ہوا تھا مولوی سید الطاف علی صاحب بی اے بریلوی ایڈیٹر مصنّف کے ایک بزرگ وہاں موجود تھے انہوں نے اپنا رومال چہرہ پر ڈال دیا[1]

---

[1] قیصر التواریخ حصہ دوم ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما از انتظام اللہ شہابی تاریخ سلیمانی از نواب سلیمان خاں بہادر متخلص آسد حیات حافظ رحمت خاں از مولوی سید الطاف علی بریلوی تاریخ بغاوت ہند از پنڈت کنہیالال۔

مولانا پیر علی

یہ بزرگ پٹنہ کے مشاہیر علماء سے تھے ان کا کاروبار کتاب فروشی تھا مگر دلمیں انگریز سے دشمنی رکھتے تھے ہنگامہ کی خبر نے انمیں بھی حرکت پیدا کر دی کاروبار چھوڑ میدان سیاست میں نکل آئے۔ عوام کو ہاتھ میں لیا اور مسلمانوں کو جہاد پر امادہ کرنے لگے علم سبز لہرایا گیا اور نقارہ جہاد بجا دیا گیا جوق جوق بلا امتیاز مذہب انکے جھنڈے تلے آ جمع ہوئے پہلا دھاوا رومن کیتھولک چرچ پر کیا ڈاکٹر لائل جو اسلام اور ہندو مذہب پر طعن زنی کیا کرتا تھا اسے آلیا وہ جان سے مارا گیا کچھ دن شہر پر غلبہ رہا مگر سکھوں کی رجمنٹ مسلح آگئی انسے نپٹنے کیا لڑ سکتے بہت سے وطن پر نثار ہوئے ۳۱ مجاہد گرفتار ہوئے پیر علی بھی پکڑے گیے لطف علی رئیس پٹنہ بھی مولانا کے ساتھ تھا اور مالی معاونت کر رہا تھا وہ بھی دھر لیا گیا۔

مگر اسکے روپیہ پیسہ نے اسکو بچا لیا۔ مولانا اور ۳۱ مجاہدین کو مسٹر ٹیلر نے دار پہ لٹکوا دیا۔ [1]

---

[1] تاریخ بغاوت ہند صفحہ ۱۶۷۔

سردار احمد خان ملتانی

سردار احمد خان قوم کہرل کے سردار تھے یہ قوم مقام جہلیرا میں آباد تھی سردار صاحب خاندانی افغان تھے۔ انکو انگریزوں سے ولی عناد تھا ملتان کے علاقہ پر اکثر انکے لوگ حملہ کیا کرتے۔ انکے دوست صوبہ دار میجر ناہر خان تھے انکو سردار صاحب نے اپنا ہمنوا بنا لیا ۶۴ - ۶۹ رجمنٹ میں میجر صاحب نے آتش مخالفت بھڑکا دی۔ انکے ہتھیار لے گئے اور ایک صوبہ دار اور حوالدار میجر نو سپاہی ۶۰ رجمنٹ کے توپ سے اڑا بھی دئے گئے۔ میجر برکت علی وردی میجر نے صوبہ دار میجر ناہر خان کو گرفتار کرا دیا اور جنرل کورٹ مارشل میں تحقیقات ہوئی جرم بغاوت ثابت ہوا فوجیوں کے سامنے ناہر خان اڑا دئے گئے[1] اس واقعہ نے ملتان میں بغاوت کی لہر پیدا کر دی اقوام خانہ بدوش نے جو قریب گوگرہ رہتے تھے وطن پرستی کی خاطر انگریزی فوج کے مقابلہ پر آ گئے تحصیل ہڑپا اور تھانہ کانولیا پر حملہ بول دیا۔ تین دستہ فوج بسرگردگی میجر چیمبرلین اور کپتان لمس اور کپتان ہوسکن سے خوب خوب مقابلہ رہا ادہر سردار احمد خان مقام جہلیرا سے فوج لیکر آ گئے مقابلہ خوب رہے برکھلی صاحب

---

[1] تاریخ بغاوت ہند صفحہ ۱۱۷ - ۱۱۸ -

اسسٹنٹ کمشنر گوگرہ قتل ہوئے کپتان لمسن نے احمد خاں کے ساتھی کو توڑ لیا جسکا نیتجہ یہ ہوا کپتان لمسن جملیرا پر حملہ آور ہو کر کامیاب ہوا احمد خان دہوکہ سے گرفتار ہو گئے انکے بعد تمام وطن پرست منتشر ہو گئے سردار صاحب کو قتل کر دیا گیا اسکے بعد پھر خوب ہی اہل ملتان کو سزا دی گئی ۔ لہ

خـتـم شُـد

لہ تاریخ بغاوت ہند ۱۱۷ - ۱۱۸ -

فہرست کتب دینی بک ڈپو دہلی

سفرنامہ اسیر مالٹا

ہندوستان کے مشہور عالم بے بدل علامہ حضرت شیخ الہند اور حضرت کے مریدین کا تاریخی اور بےمثیل سفرنامہ ہے حضرت کا دیوبند سے حج کیلئے روانہ ہونا اور دہلی میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی پر قیام اور تمام اسٹیشنوں پر حضرت کی زیارت کے لئے لوگوں کا ہجوم بمبئی سے جہاز روانہ ہونیکے بعد گرفتاری کا وارنٹ پہنچنا اور سی آئی ڈی کا حضرت کی نگرانی کرنا۔ حرم شریف سے گرفتار ہوکر مالٹا کے ایک قلعہ میں غیر معین عرصہ کیلئے نظربندی کی حالت میں فاقے پر ستر کپڑوں کی تکلیف، اشیاء کی گرانی، ہندوستان کے تجارت پیشہ حضرات کی ہمدردی، افسروں کا بیان لینا۔ اور حضرت کا بے التفاتی سے جواب دینا۔ اور افسروں کا یہ معلوم کرنا کہ مولوی محمد میاں کے ریشمین رومال کا کیا واقعہ ہے۔ حضرت کے جواب مع سوال کے درج ہیں۔ اور گورنر کا یہ کہنا کہ ہمارے کاغذات میں تو آپ کے خلاف بہت کچھ ہے۔ رہنے کی جگہ اور غسلخانہ، پنجرہ میں بند ہونا وغیرہ اس کا نقشہ بھی اس میں شامل ہے اس سفرنامہ کے متعلق بس اتنا لکھنا کافی ہے اسکو حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند نے بعض احباب کی خواہش پر اسکو قلمبند فرمایا ہے۔

قیمت مجلد دو روپے (عہ) علاوہ محصولڈاک

انزیلا

اسپین کے ایک بڑے پادری کی لڑکی ہے۔ اسنے جوان ہوتے ہی۔ اس نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا کچھ عرصہ بعد اس نے اپنے مسلمان ہونیکا بھی اعلان کیا جب عیسائیوں کو اسکے مسلمان ہونیکی خبر لگی تو تمام پادریوں نے ملکر اسپر مظالم کے پہاڑ ڈھانے شروع کر دیئے مظالم اسقدر دردانگیز تھے کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے، مگر وہ لڑکی اسلام پر ثابت قدم رہی اور اس نے اعلان کیا کہ اگر تم کو اسلام کی

حقانیت پر شبہ ہو تو میں تم سے مناظرہ کرنیکو تیار ہوں۔ چنانچہ ہمت کر کے چند عیسائی میدان میں آئے مناظرہ شروع ہوا۔ فضیلت اسلام پر جسقدر دلائل ممکن تھے وہ تائید الٰہی سے آزبلا نے پادریوں کے مقابلہ میں اس خوش اسلوبی سے پیش کئے کہ سامعین حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے، پادریوں سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ مناظرہ کی پوری کیفیت اس کتاب میں قلمبند ہے۔ اگر آپ عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام کی حقانیت کے بیشمار دلائل سے واقف حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان ہی آرڈر لکھ کر ہم سے آزبلا منگائیے۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک